محترم جناب علی محمد طارق
صاحب کی خدمت میں بصد خلوص و نیاز
موتی لعل ساقی

23/7/65

افسانے

مرتبہ

نند گوپال باوا

باوا پبلیکیشنز جموں

ناشر نند گوپال بادا
سرورق اے۔ پی۔ بشریا
مطبوعہ چاند پریس
کتابت اقبال

بار :- اوّل
تعداد :- ایک ہزار
قیمت :- تین روپے

خط و کتابت و ملنے کا پتہ

نند گوپال بادا معرفت پرتھوی راج بادلیو راج
بک سیلرز اینڈ سٹیشنری پکاڈنگ جموں (توی)

ترتیب

پہلا ایڈیشن

قیمت : تین روپے

انتساب

اس مجموعہ کو میں جناب "ڈی این کپور" کی
خدمت میں پیش کرتا ہوں۔
جو میرے مہربان اور رہبر ہیں
"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

نند گوپال باوا

بچپن میں کبڈی کھیلتے جب میری جیت تک سے "مدن" لڑکھڑا اٹھتا تو

چلا کر کہتا:

کالا کوا!

کالا کلوٹا کوا ـــــ کوا جیسے اماوس کی رات نے ـــــ اونچے پیڑ پر بیٹھ

کر ـــ سمٹ کر ـــ سکڑ کر پہاڑی کوے کا روپ دھارن کر لیا ہو ـــ

میرا رنگ گورا نہیں تو کالا بھی نہیں ـــــ گندمی سا ہے۔ ہاں کالی داڑھی

کالے بال کالا چشمہ اور کالی جیکٹ کے ساتھ اکثر کالا پتلون بھی پہنتا ہوں۔ ـــ اور

گورا چٹا بدن ـــ شربتی رنگ کے سوٹ شرٹ ٹائی اور بادامی رنگ کے

بوٹ میں سات سمندر پار کا انگریز لگتا ہے۔ ـــــ نہ جانے انسان نے

ہمارے آس پاس منڈلانے والا ڈھیٹ کوا

اپنی ہونے کی نسبت سے گندا ہے؛ یا فی الحقیقت ہر چیز ہر شے

چپکنے کی وجہ سے بدنام ہے۔ بظاہر اس گندے پرندے کے بال ... پر چگ کر

جو سچ مچ بھی گندی ہے، اُجلی نظر آتی ہے ـــ ایسے ہی بدن کی گوری کھال اور خوشنما
سوٹ کے اندر کیا ہے۔ اس کی ایک جھلک ـــ آپریشن تھیٹر کے شیشہ کی
میز پر دیکھی ـــ تو پاؤں تلے بھونچال سا آگیا۔ بلغم، پیپ، خون اور گندگی
کا ڈھیر ـــ کیا اسی کا نام انسان کی زندگی کی عمارت ہے ٹیپ ٹاپ ہے۔
اور رنگ و روغن ہے ـــ کیا یہی رنگ و روغن ـــ بدن کے خوبصورت
سیب کی سی رنگت والے چہرے پر جھلک رہا ہے۔ نکھر رہا ہے۔ ـــ
ارے کوا ـ بھیا اگر گندگی کا ڈھیلا ہے۔ تو کیا انسان بھی گندگی کے ڈھیر
کو گوری کھال اور بیش قیمت خوبصورت سوٹ میں چھپائے پھرتا ہے۔

مجھے کوے کے نام کی نسبت سے چڑ کے بجائے عقیدت سی ہو چلی
ہے ـــ کوا "گند" سے پیار کو چھپاتا نہیں۔ نہایا دھویا ستھرا سا لگتا ہے۔
اس کی کائیں کائیں دنیا بھر میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ یہ ایک بڑی بد خوشنما
۔رنگت اور خوبصورت نہ ذہنیت والے کبوتروں کی طرح بنتا نہیں ـــ کالا کوا۔
ایک ٹکڑے پر دس بیس کووں کو اپنی کائیں کائیں سے جمع کر لیتا ہے۔
کہتے ہیں تن اُجلا من میلا ـــ من کی دنیا کالی ہوتی ہو یا پیلی کس نے دیکھی
جو دیکھتا ہے رنگ و روپ پر بھول جاتا ہے۔ اور بیچارا کالا کوا نہ من میلا نہ تن اُجلا
رکھتا ہے۔ نہ اپنے کردار کو بھولتا ہے نہ دوسروں کے روپ پر فدا ہوتا ہے
آج تک دیکھا نہیں کہ اراج ہنسوں کے جھنڈ میں بیٹھ گئے مان سروور ـــ گیا ہو
اور گندگی کے ڈھیر میں من اُجلا رکھنے والے گورے چٹے بگلے راج دیکھے جو تو تاریک
گناہوں کے سیاہ رنگ میں ایسا پہاڑی کوے کے کالے روپ سے بھی کالے
ساتھیوں سے گھل مل جاتے ہیں۔

گندا کوا گندی چیز کو گند سمجھتا ہی نہیں ـــ وہ ہر چیز کو پرکھتا بھی ہے
[illegible]

جنگلی اخروٹوں کا جنم داتا کوا ہے وہ اُس چیز کو زمین میں دبا دیتا ہے جسے وہ حلق سے نہیں اُتار سکتا
اخروٹ کو توڑنا آسان نہیں۔ وہ چونچ میں اخروٹ لئے گھومتا ہے۔ اسے پرکھتا ہے۔ پھر چونچ
سے مٹی کھود کر دبا دیتا ہے۔ انسان کی نظروں سے چھپا کر ویرانوں میں — ایک دن یہ اخروٹ
جنگل بنکر — کوے کی پرکھ پر جھومتے اور لہراتے ہیں۔ لیکن حسد، جلن اور خود غرضی کے جذبات
سے کورے کوے کا ذہن اپنی محنت کے پھل کے تصور سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ماضی کو
بھلا کر حال پر نظر رکھتا ہے اور اس خیال کے ماحول میں بھی وہ اکیلے نہیں۔ ساتھیوں کو بلا کر
رجھا کر کائیں کائیں کرتے اڑ جاتا ہے — کہتے ہیں بابا آدم کے بیٹے ہابیل اور
قابیل میں مقابلہ ہوا۔ ایک نے دوسرے کے سر پر بھاری پتھر اٹھا کر دے مارا موت کے فرشتے نے
اپنا فرض انجام دیا۔ اب لاش کو ٹھکانے لگانے کی منزل کا راستہ نہ سوجھا۔ اور کتنے ہی دن
لاش کندھوں پر لدی پھرتی رہی۔ ایسے میں ایک کوا اپنے ایک ساتھی مرے کوے کو دفنانے
کی رسم ادا کرتے نظر آیا۔ آخر ٹھکانے کی منزل مل گئی — اور دنیا کے پہلے انسان کی
لاش گڑھے میں دفنا دی گئی۔ — "آدم کے بیٹے" کے تصور میں بھی "کوے"
کی تقلید اور رہنمائی فالِ نیک ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ کوے کی کالی صورت منحوس ہی سہی
— لیکن آدم کے بیٹے کے انسانوں میں گوری اور کالی رنگت کے پردوں کے پیچھے
انسانی معاشرہ اور ہمارے سماج کی وہ جھلک دکھائی دے گی۔ جسے دیکھ کر فخر اور
شرمساری کا احساس بیک وقت ہوگا — محض اسی خیال کو زیرِ نگاہ رکھ کر میں
یہ مجموعہ عرصے کو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ آپ کی فکر و نظر فن کی کسوٹی ہے
امید ہے ان انسانوں کو پرکھیں گے۔ اور مجھے اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔

نند گوپال باوا

پیش کش

"آدم کے بیٹے" کی پیش کش آپ کے حضور میں فخر، ابتہاج، مسرت اور جذبات کے تحت پیش کی جا رہی ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ یہ افسانوی مجموعہ نہ تو ندرتِ خیال، نہ انوکھے طرزِ استدلال، نہ مافوق الفطرت واقعات اور نہ ادب میں ترقی پسند انقلابی تخیلات کا مدعی ہے۔ نہ طالب ! کون نہیں جانتا ! بلند پایہ افسانہ نگاروں، مشہور زماں ادیبوں، نئی تکنیک کے فن کاروں کے شاہکاروں سے افسانوی دنیا کے کباڑ خانے، کتب خانے اور بازار بھرے پڑے ہیں۔ ان سب افسانوں کے لکھنے پڑھنے والے بھی اسی دنیا کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ اور ان کرداروں میں ہر کردار سینکڑوں افسانوں کا مجموعہ ہے۔ فطرتِ انسان کے پیچیدہ احساسات و جذبات کی عکاسی نہ ازل سے آج تک پایۂ تکمیل کو پہنچی نہ ہی تا ابد پہنچنے کی امید ہے۔ ہر دور میں لکھنے والوں نے لکھا اور پڑھنے والوں نے پڑھا۔ اور کہانی گئی پار۔ ہم سے آدم کے بعد قصہ ناتمام تمام شد ہو گیا۔

لیکن قصہ تمام شد نہیں ہوتا۔ ہر نئی کہانی بیتی کہانی سے جنم لیتی ہے۔ ہر نئی فلم، ہر نیا ڈرامہ پرانی بنیادوں پر منصۂ شہود پر آتا ہے۔ یونانی دیو مالاؤں
[illegible]

اور یہ ذرات کی دیومالاؤں کی چھان بین ہوتی ہے۔ ہومر اور گوئٹے کے افسانوں سے تما

یونانی دیومالاؤں کا فلسفہ حیات چھلکتا ہے۔ تمثیلات۔ استعارات اور تلمیحات کی
تشریح و توضیح موسیٰ اور عیسیٰ کے (امر مینوں) نامعلظ) میں ڈھونڈی جاتی ہے۔
بائیبل کے افسانے" دیومالاؤں کے مافوق الفطرت واقعات کے پردوں میں
ابن آدم کی نجات کا باعث سمجھے جاتے ہیں۔ رامائن اور مہابھارت کے
افسانوی کردار آسمانی دیوتا اور خدا کا درجہ پا کر پوجے جاتے ہیں انسان
میں انسان کو برابری کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور ظلمت کی تیرہ و
تارسنیاں بھی۔ تاریخ کا فلسفی طالب علم قوموں کے عروج و زوال کے علل
و اسباب ہر ادوار کے افسانوی ادب میں کھوجتا ہے۔ اور آخر اس نتیجہ پر
پہنچتا ہے۔ کہ "جنت سے نکالا" ہوا آدم ایک افسانوی کردار کی صورت میں زمین
پر نازل ہوا۔ اور "آدم کے بیٹے" ایک افسانہ ہے جو افسانوی کرداروں کے روپ میں
مثلاً در نسلاً، افسانہ در افسانہ کے وہ نقش ناتمام چھوڑ گئے ہیں کہ۔۔ دو لفظوں میں
پوشیدہ میری کہانی ہے! ایک لفظ محبت ہے ایک لفظ جوانی ہے۔ کہا جا سکتا
ہے۔ یا یوں کہیے کہ آدم کے دل کی آگ نے عشق مجسم کے پہلو میں پایا۔ اور آدم کے بیٹوں
نے ورثہ میں پائے حوا کے سینے کو رزمگاہ عشق بنا دیا۔ دل کی آگ نے عشق کو
عشق نے عورت کی تخلیق کی۔ اور عورت نے اس افسانوی دنیا کو جنم دیا جس کو
حسن و عشق کی دنیا کہا جاتا ہے۔ اسی حسن و عشق کی دنیا کی مٹی سے ابن آدم کا خمیر
اٹھا۔ اور یہ خمیر غم "و مسرت کے اجزا سے مرکب ہوا۔ نغمہ شادی اور نوحہ غم انسان
کی ازلی اور فطری میراث" ہے۔ اسی میراث سے گلشن دہر میں گلہائے
رنگا رنگ کھلے۔ ویرانوں نے شاداب چمنستانوں کا رنگ و روپ پایا اور
انسان اپنی مسرت کو نوحہ غم کی دستبرد سے بچانے کے لئے نبرد آزمائے
کار زار حیات [illegible]
کرنے سے کام لیا۔ لیکن ـــ آخر میں۔۔

اے سکندر نہ رہی تیری بھی عالم گیری
کتنے دن آپ جیا "جس لیے" دارا مارا

ایسی جینے اور مرنے کے درمیانی قصے نے کتنے ہی فسانے غم سنائے رکھتے ہیں دلدوز کہانیاں ابھریں اور پھر تاریخ کا مستقل باب بن گئیں۔

غم کے دو آنسو —— خون کے دو قطرے بن جاتے ہیں۔ شیکسپیر نے یہودی کی بیٹی میں دو قطرے خون —— زمین پر ٹپکنے نہیں دیئے۔ اور یہی دو قطرے خون ایک کی شادمانی دوسرے کے پاس غم کا مرقع بن گئے۔ ہیر نے زہر کے پیالے میں "دو خون کے آنسو" برسا گئی۔ اور یہ دو آنسو وارث شاہ کے افسانے کو حیات جاودانی بخش گئے۔ کالیداس کی شکنتلا دشینت کے دربار میں دو آنسو گراتی ہے۔ اور یہ گرتے آنسو کالیداس کی افسانوی شکنتلا کو تا ابد قبول عام کی سند عطا کر گئے۔

سیتا جی کے دو آنسوؤں میں راون کی لنکا بھسم ہو گئی۔ اور رشی بالمیک کی رامائن سدا کے لیے امر ہو گئی۔ دروپدی کے دو آنسوؤں کے طوفان میں اٹھارہ اکشوہنی سورما خون کے دریا میں ڈوب گئے۔ اور ویدویاس کی مہابھارت الہامی روپ پا گئی۔ زلیخا کے دو آنسو —— زندان یوسف کی دیوار کے دو روشن دان بن گئے۔ —— صغرا کے دو آنسو میں چھپی ہوئی شہدائے کربلا کی یاد حشر تک خون کے آنسو رلاتی رہے گی۔ اور "قلوپطرہ" کے دو آنسوؤں میں مصر و یونان کی دو عظیم سلطنتیں غرق ہو گئیں۔ اور اپنے پیچھے حسن و عشق کی آمیزی ہوئی آنکھوں کے سمٹے ہوئے تقاضے چھوڑ گئیں۔ غرض قدیم اور جدید دونوں ادب

لازوال داستانیں ان ہی دو جذبات کے تحت استوار کر کے مرکزی محور رہے

گرد دنیا بھر کا افسانوی ادب گھومتا نظر آئے گا۔ عشق و حسن کی پرچھائیوں
میں غم اور مسرت کے بدلے ہوئے ہزاروں رنگ و روپ کے جلوے
نظر آئیں گے۔ یہ انسان کی ازلی میراث نہ آج تک بدلی نہ حشر تک بدلنے
کی امید ہے۔ تخیلات کے پردوں پر لاکھ قوس قزحی رنگ چڑھائیے۔
نام اور عنوان میں جدت پیدا کیجئے۔ اپنے افسانوں کو ترقی پسند ادب کہئے
یا پژمردگی نام دیجئے۔ ہر نئے افسانہ اور ہر پرانی کہانی کا بنیادی
تجزیہ کرنے پر نتائج وہی برآمد ہوں گے۔ جو وجہ غم یا نغمۂ شادی کے
نتائج کا نعم البدل ثابت ہو سکتے ہیں۔

دنیا بھر کے مغربی اور مشرقی افسانوی ادب میں کتنے افسانے
لکھے گئے۔ ان کا شمار موجودہ سائنسی دور میں ناممکن ہے! لیکن کتنے
افسانہ نگاروں نے نام پایا یہ جاننا ناممکن نہیں۔ کونٹ ٹالسٹائی کے
افسانوی مجموعے کو اگر انقلاب روس کا نام دیا جائے۔ تو بے جا نہ ہوگا۔
ٹالسٹائی دنیا کے ہنگامہ کارزار کو ایک چھوٹے سے افسانے میں سمو دیتا
ہے۔ ایک انڈا دو ہمسایوں میں خون کی ندیاں بہا دیتا ہے۔ فرد سے افراد
افراد سے خاندان۔ خاندان سے خاندانوں میں حسد کی آگ میں تمام
گاؤں جل اٹھتا ہے بھسم ہو جاتا ہے۔ ایک انڈا دائمی محبت کو دائمی نفرت
میں کیسے بدلتا ہے یہ انداز بیان ٹالسٹائی کی عظیم قوت "بیانیہ" کا ہی معجزہ
ہے کہ اس کے زور قلم نے اتنی سی بات کو افسانہ بنا دیا۔ اور اس افسانے نے
انسان کی جبلی وحشیانہ فطرت کو اس خوبی سے بے نقاب کیا ہے کہ پڑھنے
والے کی روح تک لرز اٹھتی ہے۔ میکسم گورکی کا شاہکار "ماں" برنارڈ شا
کے ڈرامائی افسانوں میں ایک افسانوی کردار تاکش کا بادشاہ "جمہوری اندر"

شخصی نظام کی پس پردہ حقیقت کو جس طنزیہ انداز میں واشگاف کرتا ہے۔
کوئی دوسرا اہل قلم لاکھ کوشش کے بعد بھی ادا نہیں کر سکتا۔ ٹیگور اور سرت چندر
کے افسانوں نے فرسودہ سماج کی فرسودہ روایات کی بنیادوں کو اس سختی سے
جھنجھوڑا کہ بنگال کے ایک سرے سے دوسرے تک بھونچال سا آگیا۔ پریم چند
کے زور قلم کا اور دنیا میں فقط لطیف استعارات نادر تشبیہات شستہ اردو
اور روانی بیان کی وجہ سے ہی نہیں چلتا۔ بلکہ فطرت انسانی کے مد و جزر
کی عکاسی۔ اس کے قوت تخیل کی کرشمہ سازی ہی نہیں۔ مشاہدہ کی گہرائی اور
گیرائی کی آئینہ دار بھی ہے۔ اس لئے پریم چند کے افسانوی کردار سماج
کے جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔

ہر انسان اپنے ہی افسانے کو ذوق و شوق سے سنتا اور پڑھتا ہے
اور پھر دریائے حیرت میں ڈبکیاں لیتا ہے۔ انگریز افسانہ نگار سر آرتھر کانن
ڈائل "کا افسانوی کردار" الگ ہومز" جب اپنے دوست واٹسن کی حیرت
پر چلا اٹھتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ تم نے اوپر آتے جاتے کبھی زینے کے
پائے بھی گنے ہیں۔ کیا یہ چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔ کہ ہم نے اکثر
پاؤں کے نیچے آنے جانے والے زینے کے پائے کبھی گنے نہیں۔
فرانسیسی افسانہ نگار ــــ" مارس لیبلانک "کا افسانوی کردار" آرسین
لوپن" جب شاہ فرانس کو تعویذ نما آڑھی ترچھی لکیروں کا مطلب سمجھاتے شاہی
خزانہ کے دفن کا راز کھولتا ہے۔ تو افسانوی دنیا ہی نہیں۔ یورپی سلطنتوں
کے سیاسی ایوان بھی چونک اٹھتے ہیں جیسے آرسین لوپن دنیا بھر کے سیاسی
راز واشگاف کر دے گا ـــــ امریکی مصنف "[illegible]" امریکہ کے [illegible]

آئینہ خانوں کی کچھ جھلکیاں افسانوں میں ڈھال کر پیش کرتی ہے۔ "یہ ایوانِ حکومت
میں پہلی بار ایٹمی دھماکہ سا گونج اٹھتا ہے۔۔ سید سجاد حیدر کے افسانہ "مجھے
میرے دوستوں سے بچاؤ" نے کتنے ہی ان کے گہرے دوست بدظن کر دیئے۔
منٹو کے ہمہ گیر افسانوں اور دلکش اندازِ بیان نے کتنے ہی پاکباز ___
سیاسی اور فلمی چہرے دکھائے جنہیں دیکھنے والوں نے حیرت کی نگاہوں
سے دیکھا ___ بلند پایہ ادیب جواہر لال نہرو نے اپنی "ڈسکوری"
میں ہندوستان کی اچھوتی اور نکھری تصویر پیش کر کے مشرق اور مغرب کی
دنیائے ادب کو یوں چونکا دیا جیسے سامری نے جادو کی قلم سے
سحر طاری کر دیا ہو۔ ___ سرچشمۂ اردو ادب مولانا ابوالکلام آزاد کی "چڑیا
چڑیا" کی کہانی ___ نہ گھر تیرا نہ گھر میرا ___ چڑیا رین بسیرا کا نہ
مٹنے والا شاہکار ہے۔ جو روشِ عدیمی کے شعر میں ڈھل کر ___

اے گرفتارِ فریبِ آشیاں ؛؛ زندگی پرواز ہی پرواز ہے ___

آزاد کی چڑیا کی پرواز ذہن کے پردوں کو یوں مانوس کرتی ہے۔ جیسے
انسان کی ہوسِ خام کا انجام دیدۂ عبرت نگاہ بن کر انسانیت کو چونکا دیتا
ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں! کہ رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد کا کردار
"خوجی" خواجہ بدیع الزماں بن کر ___ آج بھی ___ ایوانِ حکومت
اور عوامی جلسوں کے سٹیج پر "ڈری لالا میری تزدل یہ مجھے سمجھا کیا ہے"
کہتے دیکھ کر بے اختیار لاحول ولا قوۃ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ___
کیا خون کا آخری قطرہ گرانے والے خواجہ بدیع الزماں پسینہ کا پہلا قطرہ
گرتے ہی "چلا دولا اٹھا" خوجی کا سا نعرہ ہی ڈیل سے نظر آتے ہیں

بھی ہم چونک نہیں اٹھتے۔

ادب کا افسانوی پہلو۔ ثقافتی، جمالیاتی، اخلاقی اور ترقیاتی جواہر پاروں سے مالا مال ہے لیکن قلم پر قدرت کا حصہ ہر ادیب کے حصے میں نہیں آتا۔ یہ ہزاروں میں نہیں۔ لاکھوں میں کسی کسی کو ملتا ہے۔ اور پھر جب یہ جوہر کھلتا ہے۔ تو اس کی جگمگاہٹ سے دل و دماغ خیرہ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خیرگی انھدیوں تک دریائے حیرت کی لہروں میں تیرتی رہتی ہے —— پھر ماضی کے خواب حال کے سنہرے سپنوں میں گم ہو جاتے ہیں یہی فطرت انسان کا افسانہ آدم ہے۔

”آدم کے بیٹے“ کے افسانے بھی عام افسانوں سے جدا نہیں۔ اس کے افسانوی کردار بھی وہی ہیں جو ہم نے جانچے ہیں۔ اور افسانے بھی وہی ہیں۔ چونکہ ماضی کی بھولی ہوئی کہانیاں کہا جا سکتا ہے انداز بیان کو بھی نیا ترقی پسند بیان نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن پھر بھی آدم کے بیٹے کو فخر ہے کہ اس کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں گو کرشن چندر“ اور ٹھاکر پونچھی کا نام نہیں ہے لیکن اسی ٹھاکر پونچھی اور کرشن چندر کی وادی کے نئے پرانے لکھاریوں کو ” نند گوپال جی“ اپنی محفل میں کھینچ لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

شری ڈی این کپور پونچھ کے مایہ ناز پرانے جرنلسٹ ہیں۔ اور شری دینا ناتھ رفیق کہانی کار نہیں کاروان شاعری کے رفیق سفر ہیں۔ جو بطور شاعر ہی نہیں بطور مسلم الثبوت استاد کے بھی پونچھ کی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔

شری [illegible] کپور کا [illegible] ”تاج محل“ اور شری رفیق کا افسانہ

”خدا کی نا[illegible]“ ان کے عوض کرم کا تحفہ ہے۔ جسے نند گوپال جی ”آدم کے بیٹے“

میں فخریہ پیش کر رہے ہیں۔ فخر یہ اس لیے کہ دورِ کہنہ کے یہ عزلت گزیں
شاعر اور ادیب دونوں کی نہ ستائش تمنا رکھتے ہیں۔ نہ صلے کی پرواہ۔
یہ حضرات زمانہ سے شاکی کبھی نہیں اور زمانہ شناس بھی نہیں۔

پونچھ کی خاک پاک میں پروان چڑھنے والے بین الاقوامی افسانہ نگار
کرشن چندر کے ہر افسانے میں حسین چمنستانِ زاد بوم کی کلیوں اور پھولوں کی
مہک شامل ہو گئی ہے۔ یہ دونوں حضرات اسی لالہ زار کے گلِ صحرائی
ہیں۔ "یادوں کے چنار" میں کرشن چندر نے جی کھول کر اپنے
بچپن کی شوخ یادوں کے نقوش ابھارے ہیں۔ آج وہ بمبئی کے تاج محل
میں پونچھ کے بچے کچے کوٹھوں کی کچی اینٹوں کو بلا سے بھلا بیٹھیں۔ لیکن وطن کی
پرانی ادبی محفلوں کے نقوش وہ لوح دل سے کبھی نہیں مٹا سکتے۔

جب ٹھاکر پونچھی سکول کے ماحول میں افسانوی ادب کی اولین منزل
تلاش کر رہے تھے۔ اور کرشن چندر ابتدائے کار کے گہوارے میں جھول رہے
تھے۔ اس وقت پونچھ میں حسرت، کپور، اور رنیتی کی ادبی محفلوں میں کرشن چندر
کے وجود کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ آج کاروانِ ادب کے میر کارواں
میں کرشن چندر اور ٹھاکر پونچھی مقام بلند پر نظر آ رہے ہیں۔ مگر یارانِ وطن
اور وطن کی سہانی یادوں کو وہ نہیں بھلا سکتے۔ پونچھ کی ادبی محفلوں کا
غبار خاطر آج بھی ان کے خانۂ دل میں کہیں نہ کہیں ضرور تہ نشیں ہو گا۔

سرزمین پونچھ کہ جہاں اپنے مایۂ ناز ادیبوں پر ناز ہے۔ وہاں نامور
ادیبوں کو بھی پونچھ کی ادب خیز مٹی پر ناز ہے۔ پونچھ کی مٹی نے ملک کے
نامور ادیب [illegible] اور آج بھی اٹھ رہے ہیں [illegible] ادیب اور
شاعروں کی نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے۔ جن میں نہ جانے کتنے کرشن چندر

حسرت اور ٹھاکر پونچھی اُبھر کر دنیائے ادب میں نام پائیں گے۔

"آدم کے بیٹے" کے مصنف مرتب کنندہ اور ناشر ابھی پونچھ کے نند گوپال باورا ہیں۔ جو حسن وسیرت کے ساتھ ساتھ حساس دل رکھنے والے نوجوان ہیں۔ مدتوں نیتری کے مزے لینے کے بعد اب امیری کی چوکھٹ پر قدم رکھنے کے تمنائی ہیں۔ اگر چہرے پر فرنچ کٹ گھونگر یالی کالی داڑھی اور کالے چشمے کو سرچشمہ ادب نہ سمجھا جائے تو آپ افسانہ نگار سے زیادہ باورا نظر آتے ہیں۔ جو اُن کا خاندانی لقب ہے۔

باورا جی کو اردو علم و ادب پر عبور کامل کا دعویٰ نہیں۔ ہاں لکھنے کا شوق سینے میں چھپائے پھرتے ہیں۔ یہ شوق اور ذوق ہی اس مجموعے کی اشاعت کا باعث ہے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ باورا جی کے تین افسانے ایک خاص تاثرات کے حامل ہیں۔ "بدل گئی" کا افسانہ عورت کی فطرت کے کمزور پہلوؤں کا عکاس ہے۔ اس کہانی کا ہیرو، عورت کے اسی کمزور پہلو کا شکار رہے۔ جو اپنے تجربہ کو دہرانا نہیں چاہتا۔ مگر حسن اور حسن عمل کے جال میں بری طرح پھنس جاتا ہے۔ اور آخر وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہیے۔ عورت کی فطری خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ اور وہ سونے کی چمک سے چکا چوند ہو کر دلوں کی سنہری دنیا کو سونا کر کے چلی جاتی ہے۔ افسانہ کا انداز بیان خوب ہے۔ لیکن کیا یہ کمزوری عورت کی ہی فطرت میں ہے۔ یا مرد بھی ہوس اور لالچ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس افسانہ میں سیٹھ جی کا کردار اس سوال کا جواب ہے۔ اور اس لحاظ سے اس افسانہ کو کامیاب افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

"ہمارے ساتھی" نند گوپال جی کا شاہکار اس لحاظ سے قابل

تعریف ہے کہ اس میں عورت کا تصور مرد کے کندھوں پر سوار نہیں ——
ایک آئیڈیل افسانہ ہے اور کامیاب —— لیکن ——

خیر چھوڑیے اس بحث کو —— "نند لال گوپال جی" نئے لکھنے والوں
کی صف میں ہیں۔ —— اور نئے لکھنے والوں کا ذوقِ عمل زمانہ
کی ذرا سی بے اعتنائی سے جی چھوڑ دیتا ہے۔

مجھے یقین ہی نہیں۔ یقین کامل ہے۔ کہ "یادا نند گوپال" حوادثِ زمانہ
کے تھپیڑوں، حاسدوں کے حسد اور جلن کی آنچ میں جھلستے ہوئے بھی
اپنے ذوقِ ادب کی کلیاں مرجھانے نہیں دیں گے۔ وہ دلی لگن سے آگے
بڑھتے جائیں گے۔ آخر ایک دن وہ بھی ہوگا جب وہ کپور جیسی ہستیوں
کی آشیرباد سے شہرت کی بلندیوں کو پالیں گے۔ اور بحیثیت ادیب کے وہ
ادب کی محفلوں میں نام پائیں گے۔ ان کے تین افسانے "آدم کے
بیٹے" کی روح رواں ہیں۔

شری شنکر ناتھ ایم اے بی ایڈ —— ایک جواں سال ادیب
ہیں۔ جنکو اردو سے زیادہ انگریزی ادب نے متاثر کیا ہے۔ اس موقعہ
پر انگریزی لٹریچر اور اردو ادب کے موازنہ کی ضرورت نہیں۔ سچ تو یہ ہے
ذوقِ عمل سلاسل کا پابند نہیں ہوتا۔ آپ کا افسانہ "انتقام" خوب ہے اور
اردو میں لکھنے کی کامیاب کوشش کا نتیجہ —— انہیں اردو میں لکھنے
کی کوتاہی کا اعتراف ہے۔ اس اعتراف کے باوجود زبان و بیان کے اعتبار
سے افسانہ مکمل ہے۔ افسانہ کی روح محبت تاجدار کے ردعمل میں ابھرتی
ہے۔ شراب کی لت چاہے وہ ایک مسلم الثبوت قانون کو لگے۔ یا عام
آدمی کو —— آخر میں جس تذلیل کا باعث ہوتی ہے۔ وہ افسانہ سے

عیاں ہے۔ انجام ٹریجڈی بھی ہے۔ کومیڈی بھی — ان کا افسانہ
باواجی کے پرخلوص پیار اور والہانہ محبت کا مظہر یہ تشکر ہے۔

میرا چھوٹا سا افسانہ "برج پاسی" واقعاتی یا ڈاکومینٹری قسم کا افسانہ ہے۔ یہ تمثیلچہ میرے وطن پونچھ کے پہاڑی علاقہ کی تمدنی اور ثقافتی ماحول کا آئینہ دار ہے۔ بقول گورودیو ٹیگور — ادب عدن کا پابند نہیں جو ادب یا ادیب اپنے وطن اپنے ماحول اپنے سماج کا عکاس نہیں ہو سکتا۔ سچ تو ہے میری وادی کی رومان پرور فضاؤں میں نہ افسانوں کی کمی ہے۔ نہ افسانہ نگاروں کی کمی ہے۔ ہاں چشم وا اور شاعرانہ دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ "برج پاسی" دیہاتی زندگی کا مرقع ہے ایک کسان کی معصوم فطرت کی جھلک۔ جس کا گھر بجلی کے قمقموں سے روشن نہیں وہ چوب چراغ سے گھر کے اندھیرے کو بھگانا چاہتا ہے اسی چوب چراغ کی روشنی میں لکھا ہوا یہ افسانہ امید ہے قاری کے ذہن پر بھی پرچھائیاں ڈالے گا۔ جو پرچھائیاں آج بھی دین محمد کے در و دیوار پر چوب چراغ کی روشنی میں ناچ رہی ہیں۔

آخر میں نند گوپال باوا کے جذبۂ شوق سے یہ کہنا ہے کہ آموزگاری ذرا دیر سے شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے۔ جب شوق کا جذبہ ذوق کی حد پر پہنچ جائے۔ تو منزل خود بخود قدم لینے آگے بڑھتی ہے۔

موتی لال کپور
ایڈیٹر پرچھائیاں
پونچھ

۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۴ء

وہ بدل گئی

پورے سال کے بعد ——— کوچہ جاناں سے گذر رہا ہوں۔
وہی مکان اور وہی در و بام ہیں ——— اسی مکان میں میرے ساتھ بیتے
حادثہ پر کسی کے چند حسین آنسو ٹپک تھے۔ کسی کی مرمریں باہوں کی آغوش
میں دن رات کے رنگین لمحات ختم ہوتے تھے۔ جوان بیمار۔ حسین تیماردار
دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں طاق پر رکھے اس کلاک کی سوئیوں سے بھی
تیز تھیں جو ہر دن دس کی جگہ بارہ کے ہندسوں پر رک جاتی تھیں۔ اسی
کوچہ اور اسی مکان میں ہمارے رومان کے دھندلے نقوش ابھی تک موجود

ہیں۔ اسی نے مجھے چاہا تھا۔ میرے صحرائے دل میں امنگوں کے لالہ زار کھلائے تھے۔ لیکن نہ جانے کیسے؟ یہ لالہ زار بہار کی آمد سے پہلے ہی خزاں کا نذر ہو گئے۔ وہ سوئے ہوئے رنگین احساسات جو ماحول نے جگائے تھے۔ مٹ گئے ــــ آج ایک برس ہو گیا ـ پورا ایک برس! اُس کے بیاہ کو ــ

وہ شادی کی نئی بہاروں میں بیتے دنوں کی یاد بھول چکی ہے ــــ وہ بھول چکی ہے کہ کسی کے زخم رسیدہ دل میں ماضی کے وہ تمام نقوش زندہ ہیں۔ جن میں کبھی بہاروں کی تازگی بھی دیکھی تھی اور جوش و شباب کی رنگینیاں اور مستیاں تھرک رہی تھیں۔ امیدوں کے سہانے چمن لہلہا رہے تھے ــــ

وہ شاید بھول چکی ہے ــــ مگر کیا میں بھول سکتا ہوں وہ دن۔ جس دن اُس نے چپکے سے کان میں کہا تھا ــ

"منہ میٹھا کرائیے جناب! آپ کا تار آیا ہے ــ

"تار ــ

"ہاں تار ـ یونیورسٹی میں آپ اول آئے ہیں ــ

"سچ ــ

"تو کیا ـ جھوٹ! اس نے شوخی سے میرا منہ چڑاتے ہوئے کہا ــ

"اب بننے سے کام نہیں چلے گا۔ مٹھائی کھلائیے ــ مٹھائی ـ پوری دو سیر! سمجھے ـ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس دی سرخ ہونٹوں سے جھڑتے پھول چاروں طرف بکھر گئے۔

"[illegible]

اُس کی ماں تار کا لفافہ ہاتھ میں لئے رسوئی گھر سے میری طرف بڑھی میں نے کھُلا تار پڑھا۔ یہ یونیورسٹی سے میرے اوّل آنے کا اطلاعی تار تھا۔

میں کماری کے مکان کے ایک کمرہ میں بطور کرایہ دار رہتا تھا۔ کھانے کا پربندھ نزدیک کے "تاج محل" تندور پہ تھا۔ میں اُلٹے قدموں "تاج محل تندور پہ پہنچا آج اس تندور کا تنور یا مجھے تاج محل کا بادشاہ سا لگ رہا تھا۔ خوشی سے پاؤں زمین پر نہ لگتے تھے اور تندور کی ٹوٹی اور میلی میزیں جیسے جھُوم سی رہی تھیں۔ شراب کی مستی میں بھوک مٹ جاتی ہے۔ میری بھوک بھی کامیابی کی مستی میں کھانے کی ضرورت سے زیادہ اکڑ کر چلنے کی خوشی میں مٹ چکی تھی۔ جیسی ہی تھالی سامنے آئی ویسی ہی لوٹا دی گئی۔ میں نے پاس کے حلوائی سے سیر بھر مٹھائی لی۔ میری خوشی میں میری شریک کماری ہی تھی جس کا منہ میٹھا کرانا ضروری تھا۔ اور یہ مٹھائی ایک ایسے حسین منہ میں گھُلنی چاہئیے جس نے میری کامیابی پر پہلی مسرت بھری مبارک باد دی تھی۔

مٹھائی کا لفافہ لئے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ جب گھر پہنچا تو کافی رات جا چکی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ کئی بار کھٹکھٹایا۔ آہٹ ہوئی۔ دروازہ کھُلا آنگن میں پہنچا تو کماری سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"آدھی رات تک آپ کے نوکر تو یہاں نہیں بیٹھے رہتے" میں نے لفافہ دکھا کر کہا۔ نوکروں کو انعام میں مٹھائی بھی تو نہیں بانٹی جاتی۔ وہ کھِل کھِلا پڑی "دیکھوں کیسی ہے مٹھائی" میں نے لفافہ آگے بڑھایا۔

اور ہوں یوں نہیں منہ میٹھا کرانے والے اپنے ہاتھ سے منہ میٹھا کراتے ہیں - میں نے برفی کا ٹکڑا جوں ہی اس کے کھلے ہونٹوں میں رکھا ـــ اف توبہ ہی کر کے ہاتھ پیچھے کھینچا ـــ انگلی میں دانتوں کی چبھن سے خون چھلکنے لگا تھا - کماری شرارت بھری ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "ہائے رام بابو جی ـــ کی انگلی ـــ لائیے باندھوں ـــ" وہ میرے کندھوں پر جھک سی گئی -

اور تب ہم دونوں کی سانسیں ملیں پہلو میں دل کی دھڑکنیں ایک ـــ عجیب سی مستی کے عالم میں کھو گئیں ـــ یہ لمحات گذرتے ہی مجھے اپنی پوزیشن کا احساس ہوا ۔ اس عالم میں کماری کی ماں دیکھ لے اس کے بھائی باپ سب جاگتے ہی ہوں گے ۔ اگر ان میں سے کسی نے ـــ میں نے ذرا سختی سے کہا کماری ؟ کماری بھی چونک اٹھی -

"کماری ـــ جاؤ ـــ چلی جاؤ - یہ سب کچھ اچھا نہیں تم چنچل ہو بہت چنچل تمہاری چنچلتا مجھے بھی لے ڈوبے گی -

وہ مسکرا اٹھی "میں منجدھار سے تمہیں کنارے گھسیٹ لاؤں گی

کیوں ۔ اتنے ناراض کیوں ہو گئے ہو ۔ بابو ؟

"اگر ماتا جی نے دیکھ لیا تو جانتی ہو ان کا غصہ ؟

" ـــ اوہ ـــ گھبرائیے نہیں ماتا جی غصہ نہیں ہوں گی آپ اپنا غصہ تھوک ڈالیے ۔ یہ کہتے کہتے وہ پھر شرارت بھری ہنسی اچھالنے لگی -

میں اس کی شوخی [illegible] پھر [illegible] انگلیوں کو جھٹک [illegible] اوپر کی منزل

میں اپنے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے زینہ پھلانگتا جا پہنچا۔ کانوں میں ابھی تک کماری کی شوخ طنزیہ ہنسی گونج رہی تھی۔

خوش ہوتے ہوئے بھی بستر پر پڑے پڑے، آج مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے سامنے ماضی کے وہ تمام نقوش اُبھر آئے جو کبھی اُبھرے تھے۔ آٹھ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ وہ جاتی تو کملا آجاتی۔ انہوں نے بھی تو مجھے اسی طرح نزدیک لانے کی کوشش کی تھی۔ جادو بھری نظروں کے جال پھینکے تھے۔ امرت بھرے جیون سپنے دکھائے تھے۔ ناولوں جیسے رومال لہرائے تھے۔ مجھے اپنا بنانے کے قول و قرار ہوئے تھے۔ لیکن آخر میں کسی نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ سب دوسرے گھروں میں چلی گئیں۔ وہ امیر تھیں۔ انہیں مجھ غریب سے کیا واسطہ۔ ان کی جوش بھری مستیاں شباب پر تھیں۔ میری جوانی کے ساتھ من چاہا کھلواڑ کرتی رہیں۔ اپنا بنایا۔ ذات ملتی تھی۔ برادری ایک تھی۔ اگر وہ چاہتیں تو ہماری شادیاں بھی ہو سکتی تھیں۔ مجھے جیون ساتھی بنا سکتی تھیں پر انہوں نے ٹھکرا دیا ایک غریب کو۔ دولت نے غریب کے پیار کو خرید لیا اور وہ پیار دولت کے ہاتھوں میں بک گیا۔

میں جھوٹے پیار کو حقیقت سمجھ بیٹھا تھا۔ لیکن یہ میری بھول تھی انہوں نے تو میری بھری جوانی سے پیار کیا تھا۔ میں دھوکے میں آگیا۔ اپنا مستقبل تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ تنگ آکر گھر چھوڑنا پڑا۔ دوستوں کے ساتھ سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اپنے عزیز شہر کو چھوڑنا پڑا جس کی دھولی میں مرکر

سرک کر پروان چڑھا تھا۔ وہیں پڑھا اور جوان ہوا تھا اسوقت میں بی اے
فائینل کا امتحان دے رہا تھا۔ امتحان دیتے ہی میں نے وطن کو خیرباد کہا
اور اسی شہر میں چلا آیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں مجھے ایک پٹرول پمپ پر ساٹھ
روپیہ ماہوار کی نوکری مل گئی۔ اچھی گذرنے لگی۔ ماضی کی یادوں کو بھلا بیٹھا تھا
نئی دنیا نیا ماحول نئے دوست بن چکے تھے۔ ایک نئی زندگی ـــــ نئے سملج
سے روشناس ہو رہی تھی۔ لیکن یہاں بھی آشا اور ملا کے روپ میں شاید
کماری رہی ہی کسر نکالنا چاہتی ہے۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں ایک آواز
گونج اٹھی ـــــ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں کل ہی دوسری جگہ کرایہ
پہ کمرہ لونگا۔ اب میں اور کوئی حسین دھوکا نہیں کھاؤں گا۔ کماری بھی تو
کھاتے پیتے امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے پاس بھی تو کوٹھی ہے چلتا
کاروبار ہے اس کی امارت بھی تو چند دنوں کے بعد مجھے ٹھکرا کر اپنی راہ لے لیگی۔
رات بھر سوچتا رہا۔ ماضی کی یادوں کو دہراتا رہا۔ آخر دل نے یہی فیصلہ کیا
کہ کل ہی یہاں سے چلا جائے۔

نیند کھلی تو سورج کی کرنیں میرے بستر پر آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔
او گاڈ ـــ اتنا دن چڑھ آیا ہے اور میں سویا ہی رہا۔ انگلی میں ٹیس سی اٹھ
رہی تھی دیکھا تو انگوٹھا اور انگلی پر کچھ سوجن سی بھی تھی۔ کتنی شوخ ہے کم بخت
نے بالکل "بندریا" کی طرح جھنجوڑ ڈالا ہے۔ خیر اب تو اس مکان کو چھوڑنا ہی ہے
اور آج ہی شام تک ـــ یہی سوچتا ہوا بنے کی لال سڑک پر نکل آیا۔ صبح کی

سیر کرنے والے رام نگر کے جوڑوں سے لوٹ رہے تھے۔ ان میں کتنے ہی شناسا تھے۔ سڑک کنارے کھڑا سوچ رہا تھا کسی سے کرایہ کے کمرہ کا پتہ پوچھوں۔ اچانک کسی نے کندھے کو چھوا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہی شوخ بندیا داتن بڑھائے مسکرا رہی تھی ــــ

" اچھے لڑکوں کو منہ دھونے سے پہلے داتن کرنی چاہیے یہ لیجئے لائی ہوں بابوجی!

" شٹ اپ ــــ میں نے داتن لے کر زور سے سڑک پر پٹک دی۔
وہ کھل کھلا کر ہنسی/ وہی شوخ ہنسی جو سیب کی رنگت جیسے گالوں میں گڑھے پیدا کرتی ہے اور ان گڑھوں میں میرے جیسے مجنوں پگھل کر سما جاتے ہیں۔
" یونیورسٹی میں اول آنے والے گریجویٹ صبح ہی صبح یوں سڑک پر کھڑے کھڑے جھک نہیں مارا کرتے ؟ یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی دروازہ میں غائب ہو گئی۔

یہ دوسری چوٹ تھی۔ میں پہلے ہی جلا بھنا کھڑا تھا۔ جھلا کر دروازہ کی جانب بڑھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی دہلیز پر جا پہنچا۔ دیکھا تو سرہانے کی تپائی پر گرم چائے کے ساتھ مٹھائی کی پلیٹ دھری ہے ساتھ ہی میں میری پسند کی سگریٹ کی ڈبیہ بھی رکھی ہے۔ اتنی ہی دیر میں کمرے کی کایا کلپ ہو چکی ہے کھلی اور بکھری ہوئی کتابیں الماری میں پہنچ چکی ہیں۔ بستر پہ نیا ریشمی گرد پوش پڑا ہے ٹوٹی کرسی کی جگہ نئی آرام کرسی بچھی ہے ــ میلے کپڑوں کی گٹھڑی غائب ہے اور دھلے کپڑے کھونٹیوں سے لٹک رہے ہیں۔

چائے کے کپ نے میری جھلاہٹ کا جوش کم کر دیا - حیران تھا آج پہلی بار ـــ یہ سب کچھ ـــ کیسے ہو گیا - یہی سوچتا کرسی پر بیٹھ گیا ـــ یہ چائے پینی چاہیئے یا نہیں ـــ دل میں پکڑ دھکڑ سی ہونے لگی - پھر نہ جانے کیونکر آخر چائے کا پیالہ میرے لبوں تک آ ہی پہنچا ـــ مگر یہ مٹھائی یہ تو میری رات کی لائی ہوئی مٹھائی کا حصّہ ہے اور ـــ سمجھا ـــ امیر گھرانہ ہے نا ذرا سے احسان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا - میرے دیئے ہوئے تحفے کا یہ بدلہ ہے ـــ اپنے آپ پر شرم سی محسوس ہونے لگی - اتنے میں وہی نقرئی ہنسی دروازے کے پٹ کے اوٹ سے اُبھری ـــ

" کیوں بابو جی ـــ چائے گرم ہے نا ـــ اور لاؤں - غصّہ کی گرمی کو گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے - پہلی مرتبہ میری نظریں اُس کی شوخ نظروں سے ٹکرائیں پھر میری نظروں نے سر سے پاؤں تک اُسی آواز اور اور نقرئی حُسن کے مجموعہ کا بھرپور جائزہ لیا - اف یہ ـــ ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی ـــ بادامی رنگ کی ساڑھی گھونگریالے بال - ہرنی کی سی موٹی موٹی سرمئی آنکھیں اور آنکھوں میں شباب کی بجلیاں کوندرہی تھیں ـــ میں اسے مبہوت بُت سا بنا دیکھ رہا تھا وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی -

" مٹھائی کھائیے نا بابو جی بہت میٹھی ہے خالص ڈالڈا اور دیسی کھانڈ کی بنی ہوئی ہے - میں سٹ پٹا اٹھا - یہ طنز کا بھرپور وار تھا - میں ذرا سستی

میں اس فطری کنجوسی پر بوکھلا سا گیا۔ پیشانی پر ندامت کے قطرے جھلکنے لگے۔

"کماری! میری کھوکھلی آواز میری حالت کی آئینہ دار تھی۔

"کہیے۔

"ماں جی — میرا مطلب ہے۔ تمہاری ماں۔

"اسی نے چائے بھیجی ہے — آپ کے پاس ہونے کی خوشی میں — وہ بھی آپ کو پیار سے یاد کرتی ہیں —

"تمہارے بھائی۔ پتا جی؟

" پتا جی بھائی سے کہہ رہے تھے دیکھو کامیابی اسے کہتے ہیں۔ آج سے آپ ہمارے گھر کے آدمی ہوں گے۔ کرایہ دار نہیں —

"کرایہ دار نہیں۔

" اوں ہونہہ — نادہند کرایہ دار گھر میں نہیں لائے جاتے۔

" نادہند کرایہ دار — میں تو ہر مہینے کرایہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" یہ حساب کتاب پیچھے ہوگا پہلے یہ مٹھائی کھائیے۔

" اپنی ہی لائی ہوئی مٹھائی کھاؤں کماری میں غریب ہوں نا غریب کا تحفہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" لوٹا کر غریب کے منہ پر ہی مارا جاتا ہے — نہیں یہ بات نہیں بابو ہم سبھوں نے تمہاری لائی ہوئی مٹھائی چکھی ہے۔ آپ کے حصّہ کی باقی تھی۔ گھر میں آئی ہوئی چیز بانٹ کر کھائی جاتی ہے۔

" ٹھیک ہے — تبھی مٹھائی کے ساتھ میری انگلیاں بھی؟

"او ــ نقرئی ہنسی پھر گونجی ــ دیکھوں تو سچ مچ مجھے رات بھر اس مذاق کا خیال ستاتا رہا ــ یہ کہتے کہتے اُس نے میری سوجھی ہوئی انگلی کو اپنی ریشمی لمبی انگلیوں میں ایکدم دبایا ــ میرے حلق سے چیخ سی نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ درد کی شدت کو بھانپ گئی۔ میری سوجھی ہوئی انگلی کو سہلاتے سہلاتے جیسے وہ خود بھی درد سے بے تاب ہو اٹھی ــ بہت بُرا ہوا ــ باؤ ــ بہت بُرا ــ اس کی گھنی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے تیرنے لگے ــ مجھے کیا معلوم۔ ٹھہریئے میں اسپرٹ لاتی ہوں ــ

"نہیں۔ نہیں۔ کماری۔ رہنے دو۔ یہ اپنے آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اب ــ اب تو میں جا رہا ہوں۔

"نہیں ٹھہریئے میں ابھی آتی ہوں ــ وہ تیر کی طرح زینے اُترتے چلی گئی۔ پلٹ کر آئی تو اسپرٹ کے ساتھ پلیٹ میں رس گلے بھی تھے۔ لال لال کالے تازہ رس گلے۔ اُس نے پہلے سپرٹ کا پھاہا رکھ کر میری انگلی کو ریشمی رومال سے باندھا۔ پھر رس گلوں کی پلیٹ سرکاتے ہوئے کہا ــ

"میں نے آپ بنائے ہیں۔ آپ کے لئے!

"میرے لئے؟

"ہاں چکھیے تو سہی ــ خاص چیز ہے ــ

"خاص چیز ــ میں نے ایک رس گلا اُٹھا کر نگل ہی ڈالا تو کچھ کڑواہٹ سی محسوس ہوئی ــ یہ کیا ــ رس گلا کڑوا کسیلا سا کیوں ہے؟

کماری پہلے تو لال جتن کئے ہنسی ضبط کئے بیٹھی رہی ــ پھر وہ کھل

کھل ہنستی بھاگ گئی۔

ارے یہ کیا شاید زبان کی کوئی رگ کٹ گئی۔ اتنا خون، پانی کا جگ پاس ہی رکھا تھا۔ غراروں پر غرارے کئے کھایا پیا اُبل آیا — اب پتہ چلا کہ رس گلوں میں لال رنگ بھرا ہوا تھا۔ اچھے احمق بنے — اب اِس گھر میں اس حسین بندریا کے ساتھ — ناممکن۔

میں نے مصمم ارادہ کے ساتھ بستر پٹینا شروع کیا۔ پیٹھ پیچھے ایک بار پھر وہی ہنسی گونجی۔

" بستر کیوں لپیٹا جا رہا ہے۔ بابو —

" میں جا رہا ہوں۔

" جا رہے ہیں۔ کہاں ؟

" جہاں قسمت لے جائے۔ تمہیں اس سے کیا مطلب۔ !

" او بہت ناراض معلوم ہوتے ہو۔ ارے پہلے آئینہ تو دیکھیے۔ !

یہ کہہ کر اس نے آئینہ سامنے کر دیا۔ خدا کی پناہ۔ سارا حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔

منہ سے ٹپکے لال رنگ کی دھاریاں ٹھوڑی پر پھیلی ہوئی تھیں ہونٹھ کچھ سوجھے ہوئے چہرہ پر بھی رنگ کی پرچھائیاں۔

" واہ جی واہ — جے مہاویر کی اب فقط دُم کی کسر باقی ہے۔

کماری — منہ میں پلّو دبائے کھل کھل زور سے ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

"ہمارے غسل خانے میں پہلے نہا لیجئے بابو ـــــ اس کی ہنسی زخموں پہ نمک چھڑک رہی تھی۔ میرا غصہ بیکسی کی آنچ میں پگھل کر اب رو دینے کی حد تک آپہنچا تھا۔

میں نے گلو گیر آواز سے کہا۔

"کماری میں پردیسی ہوں۔ چار دن تمہارے گھرانے میں آرام سے گذارے ہیں دیکھ رہا ہوں اب یہاں گذر ہونی مشکل ہے۔ تمہاری لگاوٹ مذاق اور ہنسی ـــــ ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری تک آپہنچی ہے ـــــ تم نہیں جانتی کماری ـــــ میں پیار محبت کے معاملے میں بہت سے حسین دھوکے کھا چکا ہوں۔ ان دھوکوں نے میری پیار محبت کی راہوں میں کانٹے بکھیر کر رکھ دیئے ہیں۔ ان کانٹوں سے گھبرا کر ـــــ بھائیوں دوستوں، ماں باپ کو چھوڑ کر پردیس میں آپ اپنی مدد کے اصول پر عمل کرنے آیا ہوں۔ میرے پہلو میں ایک ٹوٹا ہوا دل ہے اور اس دل نے عہد کر رکھا ہے کہ نہ کسی کے ہو نہ کسی کو اپنا بناؤ۔ اب یہ عہد چاہتا ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے بھاگوں ـــــ میں شام تک دوسرے کرایہ کے مکان میں چلا جاؤں گا۔

کماری سر نیچے کئے چپ چاپ سنتی رہی ـــــ میری بات ختم ہوتے ہی اس نے سر اٹھایا اب اس کا ہنستا چہرہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح تھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"تو کیا آپ سچ مچ یہاں سے .... وہ آگے نہ بول سکی۔

"ہاں کماری میں سچ مچ ـــــ

"نہیں — بابو — نہیں — آپ یہاں سے نہیں جا سکتے میری خطائیں بخش دیجئے۔ اب میں بھول کر بھی ہنسی مذاق ————

"میں تمہارے ہنسی مذاق کی باتوں سے گھبرا کر نہیں بھاگتا۔ میں دلوں میں اُس چھپی ہوئی آگ سے ڈر کر بھاگ رہا ہوں۔ جسے محبت کہتے ہیں۔ محبت گناہ نہیں۔ تم بھی نکھرتی جوانی میں ہو میں بھی شباب کی پہلی منزل میں قدم رکھ چکا ہوں۔ دو دلوں کی دھڑکن کا نتیجہ — بیاہ کا بندھن ہے یہ بندھن — سماج — کی مرضی کے تابع ہے — اور سماج نے ایک غریب کو امیر کی محفل میں بیٹھنے کا حق نہیں دیا ہے۔ میں پردیسی ہی نہیں ہوں غریب بھی ہوں اور تم ایک امیر خاندان کی لاڈلی ہو ——

"بس کرو — بابو — بس — میں ایسی باتیں سننا نہیں چاہتی وہ آنکھوں سے آنسو برساتے بولی۔ تم یہاں سے جانے نہ پاؤ گے — صبح گئے شام کو ضرور آؤ گے۔

یہ کہتے کہتے وہ آنچل سے آنکھیں پونچھتی ماں کے پکارنے پر نیچے چلی گئی اور میں نہا دھو کر مکان کی تلاش میں نکل پڑا۔

میں نہیں جانتا تھا کیوں؟ مگر کماری کی بات ٹھیک ہی نکلی۔ میں صبح کا گیا شام کو لوٹ آیا اُسی کمرے میں — لیکن کیسے؟

نئے کمرے کی تلاش میں دن بھر بھٹکتا رہا یہ تلاش شام کے قریب کامیاب ہوئی۔ جیل روڈ کی نکڑ پر ایک کمرہ مل گیا — اب مجھے اتنا یاد ہے کہ

نیچے جھکا ہوا دروازے کے تالے میں چابی گھما رہا تھا کہ ایک زور دار
گڑگڑاہٹ پیٹھ کے پیچھے اُبھری اور لمحہ بھر میں جیسے کسی طوفانی جھونکے نے
اُچھال کر مجھے سامنے نوک دار کنکروں کے ڈھیر پر منہ کے بل زور سے پٹک دیا۔
آنکھوں کے آگے چنگاریاں سی ناچ اٹھیں ـــ تن سے روح جدا ہوتی ہوئی معلوم
ہوئی اور پھر تیرگی ہی تیرگی میں ڈوبتا چلا گیا ـــــــ

یوں ہی پھر پھریری سی آئی بدن میں حرکت کے ساتھ ہی ٹیس محسوس
ہوئی ۔ کانا پھوسی سی ملی جلی آوازیں اور سسکیاں سننے لگے آنکھوں کو
کھولنے کی کوشش میں بے چینی بڑھی مگر ایک ہی آنکھ کھل سکی دوسری پر
پٹی بندھی ہوئی تھی ۔ دھیرے دھیرے ہوش آگیا ہاتھوں نے چہرہ کو چھُوا تو
اُف توبہ ! چہرہ پر پٹیاں ہی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ۔ کماری کی ماں کی
آواز کانوں میں گونجی ـــ " تو ہوش آگیا ـــ کیوں بیٹے جی کیسا ہے
ـــ لہجہ میں خوشی جھلک رہی تھی ۔

" اچھا ہے ماں جی ۔ پانی !

کماری نے گلوکوس کا گلاس لبوں سے لگا دیا ۔ پانی پیتے ہی بدن
میں توانائی سی آئی اُٹھ کر بیٹھنے لگا تھا کہ تین چار آوازیں ٹکرائیں ۔" بیٹے
رہیے بابو ـــ لیٹیے ہلئیے مت ـــ شکر ہے ہوش آگیا ـــ رام جانے
رات بھر کی بیہوشی ـــ سے ہم کتنے نراش تھے ۔"

میں نے آدھ کھلی آنکھ سے کمرہ کا جائزہ لیا ۔ میں اپنے ہی پلنگ
پر لیٹا ہوا تھا کماری پائینتی کھڑی تھی اور اُس کی ماں ... بیٹھی ہوئی تھی سامنے

کماری کا بھائی اور پتا جی کھڑے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر بیگ لئے داخل ہوا۔

"کیوں بابو طبیعت کیسی ہے۔؟

" اچھا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ مگر یہ ہو کیسے گیا؟

" گھبرائیے نہیں جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ داہنی ٹانگ پر چوٹ آئی ہے داہنی آنکھ کا ڈھیلہ بھی محفوظ ہے۔ دیکھیے ہلنے جلنے کی کوشش نہ کیجیے چہرہ کے زخم بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ہائے بھگوان یہ کیا سُن رہا ہوں۔ چہرہ داغدار آنکھ کانی اور ٹانگ لنگڑی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہا مگر رو نہ سکا ___ پہلو میں نوجوان اور نہ مردانہ دل رکھتا تھا جو تراشا دادی نہیں آشادادی تھا نیم غشی کی سی حالت میں ڈاکٹر کو اپنے چور چور جسم کی مرمت کرنے کا کام دیکھتا رہا۔ اور محسوس کرتا رہا کہ میری حالت پر چپکے چپکے آنسو بہانے والی مجھے گلوکوس دودھ اور انار کھلانے والی ہستی کوئی اور بھی ہے جو دن رات میرے پلنگ کے پایہ کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ میں سوتا ہوں تو وہ جاگتی ہے وہ سوتی ہے تو میں جاگتا رہتا ہوں نہ جانے کیوں؟

دو تین دن بیت گئے اب میرے بدن میں توانائی آچکی تھی ___ آج جب وہ دودھ پلا کر تولیہ سے میرا منہ پونچھ رہی تھی۔ تو میں نے پوچھ ہی ڈالا ___

"کماری؟

"جی ___

"یہ تو بتاؤ مجھے ہوا کیا میرا جسم ___

"آپ سیٹھ کی کار سے ٹکرا گئے تھے۔ موٹر کے مڈگارڈ نے تو کیلے کنکروں کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ شکر کیجئے۔ موٹر کے پہیے رک گئے ۔۔۔ سیٹھ جی آپ کو یہاں لاکر چھوڑ گئے تھے۔ آپ کو ہوش ہی نہ تھا۔

"بڑی مہربانی کی۔ بیچارے سیٹھ نے مجھ غریب پر۔۔۔!"

وہ مسکرائی۔ "بڑے ہی نیک ہیں روز آکر حال پوچھتے ہیں۔ ڈاکٹر کو وہی لائے تھے۔ آپ کو بھی جانتے ہیں کہتے ہیں بابو بہت محنتی ہے۔ اسے ترقی دلواؤں گا۔

"ترقی ۔۔۔ ہاں غریب کی جان کی قیمت ترقی کے چند روپے ہی ہوتے ہیں نا سیٹھ جی بہت دیالو ہیں۔

"چپ رہیے زیادہ باتیں کرنے سے ڈاکٹر نے روک رکھا ہے۔

"کاش یہاں اٹھالانے کے بجائے سیٹھ جی موٹر تلے ہی پیس ڈالتے۔

"یہ ہو جاتا تو پھر میری بات کیسے پوری ہوتی۔۔۔

"کونسی بات ۔۔۔

"بھول گئے۔ اور پھر وہی ہنسی، میں نے کہا تھا نا۔ زمین گول ہے۔ صبح کے گئے رات کو ٹھکانے پر آ ہی جاتے ہیں۔"

جواں بیمار۔ حسین تیماردار ۔۔۔ میرے بدن کے گھاؤ بھرتے گئے مگر دلوں کے گھاؤ کھلتے گئے۔ میں جوں جوں ٹھیک ہو رہا تھا۔ ہماری کی ہنسی مذاق اور لگاوٹ کا انداز بھی بڑھتا جا رہا تھا ۔۔۔ وہ کالج کے چند

گھنٹے بے چینی میں گذار کر واپس آجاتی۔ ان چند گھنٹوں میں میرا دھیان اسی کا پیچھا کرتا رہتا ـــ وہ آتے ہی کتابیں پٹک کر میرے سرہانے بیٹھ جاتی۔ میری بڑھی ہوئی داڑھی میں اپنی مخروطی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگتی ـ میں بوکھلا اُٹھتا ـ تو تھپک کر عجیب انداز میں کہتی ـــ "مولوی جی ـــ گھبرائیے نہیں داڑھی میں جوئیں ٹٹول رہی ہوں ـــ اور جب میں جوؤں کے ڈر سے سچ مچ ـــ؟ جھلاسا اُٹھتا تو وہ کھل کھل کرتی بھاگ جاتی میرے چہرے کے کھردرے نقش کھرے نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے شیو کرنے کی ممانعت کر رکھی تھی۔

ایک مہینہ بیت گیا ـ اب میں اُٹھ بیٹھ سکتا تھا مگر داہنی ٹانگ لنگڑاتی سی معلوم پڑتی تھی۔ اور آنکھ کے پپوٹے بھی سُوجے ہوئے تھے۔ پلنگ پر پڑے پڑے سوچتا تھا۔ کماری کی تیمارداری میرے خانہ دل میں کیوں سمارہی ہے۔ اس کا اور میرا میل کیسے ہوسکتا ہے۔ پہلے حسین دھوکوں کی طرح یہ حسین دھوکا بھی زندگی تباہ کر کے رکھ دے گا ـ نہیں ـ نہیں۔ اُسے سمجھانا ہوگا۔ اُسے بتانا ہوگا کہ وہ مجھ غریب پردیسی پر اپنے پیار کی ندی نہ بہائے۔ اس ندی کے طوفان میں وہ آپ نہیں ڈوبے گی۔ مجھے بہا دیگی ڈبو دیگی۔ وہ بدل سکتی ہے۔ وہ بدل جائے گی ـ مگر میں ـ کسی کی ہنسی نے سوچ کے بہاؤ کا رُخ موڑ دیا۔

"کیا سوچا جا رہا ہے مولوی جی!

"سوچتا ہوں کماری! میں نے رُک رُک کر کہا ـــ تم میرے

لئے دن رات ایک کیوں کر رہی ہو بتاؤ میں اسکا صلہ کیا دے سکتا ہوں۔ ٹوٹے ہوئے دل سے محبّت کے نغمے نہیں پھوٹتے غم کے نالے بلند ہوتے ہیں۔ پھر میری ٹانگ ـــــ میری آنکھ۔ تم ہی کہو۔ لنگڑے۔ کانے اور غریب سے کوئی حسین لڑکی بیاہ کے لئے تیار ہوگی۔

وہ چپ سی ہوگئی۔ پھر وہی ہنسی ناچ اٹھی۔

" میرا خیال تو ایسا نہیں ؟

" تمہارا ایسا خیال نہیں یہ کیا کہہ رہی ہو کماری ؟

" سنئیے۔ وہ رک رک کر متانت سے بولی۔

" نردھن ہونا قسمت کی بات نہیں اپنے بس کی بات ہے۔ لنگڑا جیون ساتھی اس لئے اچھا رہے گا کہ وہ دوسری بار کسی سیٹھ کی کار کے نیچے مر دینے نہیں جائے گا۔

" اور کانا بابو ـــ

" ایک ہی آنکھ سے دنیا دیکھنے والے کو ہر کوئی سراہتا ہے۔ آپ فکر مت کیجئے بابو ـــ آپ نہ کانے رہیں گے نہ لنگڑے دیکھنا دو چار دنوں کے بعد سڑکوں پر جھک مارنے کیلئے آپ ہی آپ چنگے بھلے ہو جائیں گے۔

اور سچ مچ دو چار دنوں میں تو نہیں پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد سڑکوں پر جھک مارنے کے لئے میں بھلا چنگا ہوگیا۔ یہ سب حسین تیمار دار کی تیمار داری کی کرامات تھی۔ اب نہ میں لنگڑا تھا نہ کانا بلکہ پہلے سے بھی ہٹا کٹا اور چاک چوبند تھا۔

آج صبح ہی صبح حجام نے آکر بال بنائے - کھردری اور جاہی ترچھی داڑھی کی مصیبت کو بڑی احتیاط سے دُور کیا - نہا دھو کر نیا سوٹ پہنتا ٹائی کی گرہ درست کرنے کے لئے آئینہ کو ڈھونڈ رہا تھا کہ کھِل کھلاتی کماری کے ہاتھوں نے آئینہ پیش کر دیا -

واہ بھگوان تیرے رنگ، اپنے آپ کو دیکھ کر پہچان نہ سکا - شیو، کلین چہرہ گلاب کے پھُول کی طرح نکھر آیا تھا اور پہلے کی طرح آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ حلقے دُور ہو کر چہرہ پر نئی اُمنگوں کی سرخی جھلک رہی تھی ـــ

" اتنے دھیان سے اپنے آپ کو نہ دیکھئے نظر لگ جائے گی -

" نظر ـ کس کی تمھاری ـــ یہ کہتے کہتے ـــ کماری کے جمال پر میری نظریں گڑ گئیں - گلابی ساڑھی میں آج وہ ایسے لگ رہی تھی جیسے اندر لوک کی اپسرا زمین پر اُتر آئی ہو - میری باہیں بے اختیار بڑھیں اور اُس نے بھی بے اختیار اپنے آپ کو میری کھلی باہوں کے سپُرد کیا - --

ایک لمحہ میں میرے تمام " عہد " ماضی کا افسانہ بن گئے ایک لمحہ میں دو دلوں کی دھڑکنیں ایک ہو گئیں اور ایک دوسرے کے ہونٹوں پر امٹ پیار کی چھاپ لگ گئی - یہ سب کچھ چند لمحہ میں ہو گیا ـــ زندگی کی طویل راہوں میں نہ بھولنے والی یاد کے چند لمحے کتنے جلد ختم ہو جاتے ہیں - آج دن پھر میری صحت یابی کی خوشی میں گھر بھر میں ہنگامہ سا بپا رہا - کماری کی ماں نے ملنے چلنے والوں کو دعوت دے رکھی تھی ـــ آج پورنماشی کی

ماں نے ملنے جلنے والوں کو دعوت دے رکھی تھی ـــ آج پورنماشی کی رات تھی اور چھٹکی ہوئی چاندنی میں گھر کی چھت پر ہم دونوں اکیلے بیٹھے تھے۔

"کماری ـــ تم نے مجھے نیا جیون دان دیا ہے۔ میں نہیں جان پاتا تمہارے ماتا پتا، بھائی، مجھ غریب پر اتنے مہربان کیوں ہیں بتا سکتی ہو اس میں کیا راز ہے۔

"راز ـــ کوئی راز نہیں بابو ـــ ماں جی کو تمہارا خاص خیال رہتا ہے۔ انہوں نے ہی مجھے تمہاری سیوا کی آگیا دے رکھی ہے۔ میں نے ـ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ اب میں کیا بتاؤں نہ جانے کیوں کیا ہے۔

"کماری تم نہ جانو میں جانتا ہوں۔ صاف صاف کہو۔ کیا تم میرا جیون ساتھ دینے کو تیار ہو؟

"ہاں۔

"تم جانتی ہو میرے پاس تمہارے دینے کے لئے کوئی تحفہ نہیں۔ ایک انگوٹھی ـــ کے سوا۔ کیا تم ایک نردھن کو اپنا پیار دے سکو گی؟

"کہہ نہیں سکتی بابو ـــ میں نے دھن کو نہیں تمہیں اپنایا ہے۔

"جھوٹ، آج کی محبت کی دنیا میں سونے چاندی اور نوٹوں کو اپنایا جاتا ہے۔ آج جو تم کہہ رہی ہو۔ وہ کل نہیں کہو گی۔ دنیا کے بدلتے رنگوں میں تم بھی بدل جاؤ گی کماری۔!

"میں بدل جاؤں گی۔

"ہاں ـــ کماری۔ پرانی محبت کی یادوں کو کوئی نہیں دہراتا ـــ

سونے چاندی کی جھنکاروں میں بدلنے والی محبت، خوشبوؤں کے جھونکے میں جھومتے ہوئے یہی کہتی ہے۔ الھڑ جوانی کی غلطیاں یاد رکھنے کے قابل نہیں ہوتیں یہ غلطیاں ریشمی کپڑوں میں گم ہو جاتی ہیں ۔

"بابو، نہ جانے تم کیا کہتے ہو ۔ کماری تمہیں چاہتی ہے ۔ تمہاری دھن دولت کو نہیں ۔ دیکھ لینا کماری اپنی بات کی کتنی پکی ہے ۔ وہ کبھی نہیں بدل سکتی ۔ وہ کبھی نہیں بدلے گی ؟"

"تو کیا یہ قول و قرار پکا ہوگا ۔ کہ تم کبھی نہیں بدلوگی ۔

"ہاں ۔ کبھی نہیں بدل سکوں گی ۔"

مگر ۔ آخر کار وہ بدل گئی ۔ پورے چھ مہینے بیتنے سے پہلے ہی بدل گئی ۔ میں نہیں جانتا کیسے ۔ مگر اس کی شادی سے تین دن پہلے میں نے سنا کہ کماری کی نسبت ایک امیر گھرانے میں ہو گئی ۔ جہاں موٹریں ہیں ریشمی کپڑے ہیں، سونے کے کنگن ہیں اور نوٹوں کے انبار ہیں ۔ کماری سونے چاندی کے کھلونوں سے کھیلے گی ۔ جڑاؤ کنگن پہنے گی اور یہ کنگن پہن کر میری حقیر سی انگوٹھی بھول جائے گی ۔ زرتار عروسی جوڑا پہنتے ہی بدل جائے گی ۔ اور سچ مچ تیسرے دن ایسا ہی ہوا ۔ دروازے پر بڑے ٹھاٹھ کی برات اتری ، بینڈ دل سے ادھیڑ عمر کے موٹے دولہا کے گلے میں کماری نے جے مالا پہنائی ۔

یہ دولہا وہی سیٹھ صاحب تھے جن کی کار کے نیچے نیم مردہ جسم

کو کماری کے گھر پہنچا کر نمنتون احسان کیا تھا اور اس احسان کے
بدلے میں کماری کے حسن اور جوانی کی چمک سے چکا چوند ہو کر کماری کو
مایا کی چھایا میں "سورگا پوری" کی جھلک دکھا کر ایک تیر دو شکار کے
مقدس فرض کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ یہ سیٹھ جی کی
دوسری شادی تھی؟

رات بیت چکی تھی — نورانی صبح سے پہلے ہی میرے اندھیرے
کمرے کے پٹ کھلے۔ کمرے کی نیم سی تاریکی میں بجلی سی چمکی، خوشبو کی
لپٹیں — سرسراتا ریشمی لباس۔ جڑاؤ کنگن کی شعاعوں سے کمرے میں
قوس و قزح کی لہریں تھرک اٹھیں۔

"کماری تم —"

"ہاں — بابو — میں — تیز لپ اسٹک سے رنگے ہوئے ہونٹوں پہ
وہی دلفریب مسکراہٹ تھی — مگر آنکھوں میں آنسو —

"کماری — میں نے کہا تھا نا سیٹھ جی بڑے دیالو ہیں — دیکھو یہ
— میرا اپنا جیون تو ان ہی کی دین ہے۔ تمہیں بھی ساکشات لکشمی کا
روپ دے کر اندرا پوری کی رانی بنا دیا ہے کیوں؟ دھن ہیں نا سیٹھ جی
— تمہیں مبارک ہو — ٹوٹے ہوئے دل کے نالے سننے آئی ہو — تو سنو۔
ایک طرف بے پناہ حسن — دوسری طرف بے پناہ محبت سے بھرا ہوا خالی
دل — بیچ میں لکشمی آ گئی — لکشمی کے جھنکار نے حسن کو [illegible] لیا۔ ٹوٹے
ہوئے دل کے تار جھنجھنا کر رہ گئے۔ مایا کے روپ نے سب کچھ بدل ڈالا۔ اب
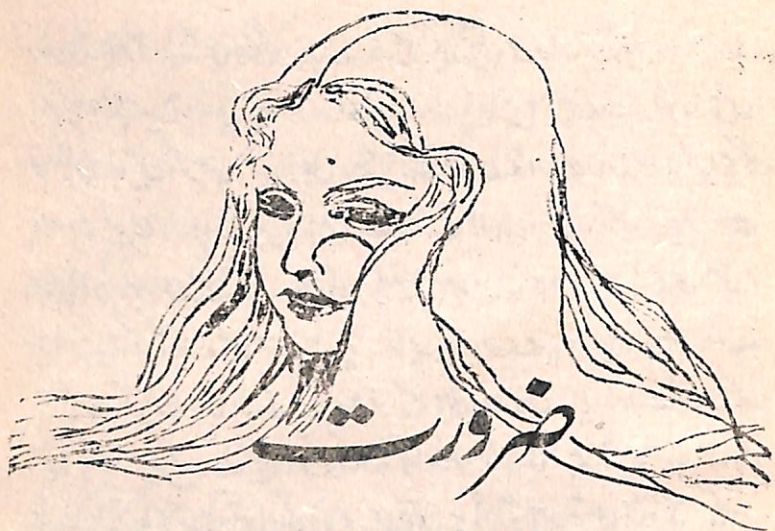
"........کیوں ؟"

"رات دن کی پریشانی تو دور ہو جائے گی۔"

"رانی —" وہ گرجا۔ اور پھر ضبط سے کام لیتا ہوا بولا۔

"رانی تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیئے۔"

"مجھے ! افسوس ہے راجو — میں ایسی تنگ دستی میں چھپی ہوئی مجبوریوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ گھر — یہ اخراجات — پھر مستقبل ؟ تمہاری تعلیم۔ ماں کی دیکھ بھال۔ اگر تم دن رات ایسی ہی الجھنوں میں پھنسے رہے تو تمہاری صحت کا کیا بنے گا۔ پچھلے سال بھی تم فیس بھر کر امتحان میں نہیں بیٹھ سکے۔ اسی لیئے تاکہ آپ کے [illegible]

نہ کوئی کام ڈھونڈ ہی لوں گی۔ جہاں سے بھی کچھ پیشگی مل جائے تو ....

"تم ایسا سوچنا چھوڑ دو رانی   یہ میرا فرض ہے تمہارا نہیں۔
تم نہیں جانتیں اگر میں اپنے فرض سے کوتاہی کروں تو ان مزدوروں کا کیا ہوگا۔
جو صرف میری ذمہ داری پر کام میں جٹے ہوئے ہیں۔ انہوں نے میرے ذریعے
ہی اپنی مزدوری لینی ہے۔ ان کی ہر ممکن سہولیت کا فرض میں نے ہی انجام
دینا ہے۔ تاکہ آئندہ بھی ضرورت پڑنے پر یہ میرے کام آسکیں۔ لیبر دے
سکیں۔ اگر آج میں ان کی پرواہ نہ کر کے اپنی راہ لوں۔ میرے لئے کہاں تک
اچھا ہوگا۔ پھر میں نے بھی تو ابھی تک تنخواہ ہی نہیں لی ہے۔ جس ضرورت کے
لئے میں نے یہ نوکری قبول کی وہ پوری نہیں ہوئی۔ تو بھلا تم ہی بتاؤ کہ کیسے
یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر میرے پاس اتنی ہمت ہوتی تو کیا میں یہ سب
کچھ نہ کرتا؟"

وہ راجو کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ اور چپکے سے اٹھکر اپنے
بستر پر چلی گئی ——— اور پھر حال کو بھول کر ماضی کے خوابوں میں کھو گئی۔ ماضی
کے وہ نقوش ایک ایک کر کے اُس کے خوابوں میں اُبھرتے رہے اور مٹتے رہے
بچپن۔ اسکول اور کالج کی زندگی .... پھر   ایک وہ دن
بھی آیا جب ماں نے پوچھا تھا۔ بیٹی آج وہ لوگ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں.....!
کون لوگ ماں؟ چونک کر اس نے پوچھا۔

ماں بولی وہ ہے نا اپنا راجو اس کے ماتا پتا۔ کیا ہوا بیٹی اگر وہ آج غریب

ہو گئے ہیں۔ یہ دن تو سب پر ہی آتے ہیں۔ میں راجو کی ماں کو دیا ہوا بچن کھو رہے

ہی ٹال سکتی ہوں۔ دنیا تو بہت کچھ کہتی ہے کہ ان کی دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی لیکن بیٹی میں اس کی پرواہ نہیں کرتی۔ اور پھر بیٹی تم بھی راجو کو چاہتی ہو کیوں؟ ٹھیک ہے نا — رانی کے ہونٹوں پر اپنے آپ مسکراہٹ ناچ اٹھی۔

بیاہ ہو گیا — کتنی اچھی ساس ملی۔ اس دن کتنے پیار سے پکارا؟

"بہو رانی! اٹھو دیکھو نا سورج نکل آیا ہے اور تم ابھی تک سوئی پڑی ہو۔ طبیعت ٹھیک ہے نا —"

"آں......ہاں ماں جی"

"تو اٹھو بیٹی" منہ ہاتھ دھو لو۔ ناشتہ تیار ہے؟

بڑے آرام سے دن گذر رہے تھے۔ راجو کی ماں نے کچھ بچائی ہوئی پونجی سے گرہست کا ٹھاٹھ بسار کھا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ پونجی چھ ماہ سے زیادہ نہیں چلے گی۔ بعد میں کیا ہو گا۔ وہ اسی فکر میں گھل رہی تھی۔ حالانکہ اس نے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ ہم پر برے دن آ رہے ہیں۔ مگر رانی اس حالت کو پہلے سے ہی جانتی تھی۔ وہ رات دن نت نئے منصوبے سوچتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر راجو بی۔ اے کر لے تو اسے کہیں نہ کہیں کوئی نوکری مل ہی جائے گی۔ پھر سدا یہ دن تھوڑے ہی رہیں گے۔ اسی طرح وہ اپنے دل کو تسلی دیتی اور راجو کے شوق کو ابھارتی رہتی۔ مگر ہنیں دن تو برے آن پڑے تھے۔ ان میں کیسے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکتی تھی۔

ستاروں کی طغیانی نے اُس کے تمام منصوبوں کو درہم برہم کر دیا۔ اُس کے ادھورے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس کے ماتا پتا کی ساری جائیداد

مکان زمین آس طغیانی کی نذر ہو گئی ۔ مشکل سے جانیں بچا کر تن کے کپڑوں میں نکل پائے ۔ اُس کے ماں باپ پہلے جو آسودہ حال تھے ۔ وہ بچارے بھی اسی صف میں آ گئے بلکہ ان سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے دن کیونکر بیتے ۔ امتحان میں بھی اب چار ماہ رہ گئے تھے ۔ اس کے دل میں آپ کوئی کام کرنے کی سوجھی لیکن راجو کا کہنا تھا ـــــ " میری زندگی میں تم ایسا سوچو یہ میری عزت سے کھیلنا ہے میں یہ اچھا نہیں سمجھتا اور خاصکر ایسے زمانے میں جہاں دن دہاڑے بدکاریاں ہوتی ہوں ۔ بہو بیٹیوں کی عصمتوں پر ڈاکے ڈالے جاتے ہوں ۔ مجبوریوں کا فائدہ اُٹھا کر بُری راہ پر چلانے والوں سے یہ دنیا بھری پڑی ہے ۔ میں نہیں چاہتا تمہاری بے چارگی بھی بُری راہ پر چل پڑے ـــــ "

" آخر میں آپ کے لئے ....

" میں یہ سننے کے لئے تیار نہیں کہ میری بیوی آئے دن خانہ داری سے باہر رہ کر میری ضروریات کو پورا کرنے کا سادھن بن جائے ۔ میں اپنی حالت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں تمہیں کسی چنتا کی ضرورت نہیں "

کاش ! ابھی ہماری شادی نہ ہوئی ہوتی ۔

" کیوں ؟

" کم از کم گرہستی کی فکر سے آزاد رہ کر اپنی تعلیم کو تو پورا کر لیتے ۔ بیاہ کے بندھن نے رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں ۔ "

" نہیں رانی ایسی بات نہیں ہے ۔ یہ بندھن ایسا نہیں ہوتا بلکہ یہ بندھن

دوھاتما کا بنایا ہوا ایک پاک اور نہ ٹوٹنے والا بندھن ہے ۔ عورت ہی کائنات کی

کی روح اور نسل انسان کی خالق ہے اور پھر ہم دونوں کی مرضی پر ہی تو ہمیں جیون ساتھی بنا دیا گیا ہے۔"

"جلدی تو آپ نے ہی کی تھی۔"

"ہاں کیوں نہیں اب تم ایسا ہی کہو گی۔ بھول گئی ہو وہ دن جب تم کہتے کہتے رُک گئی تھیں .... میں نے کہا تھا کیوں رک گئی ہو .... جان لو تا تم ہی .... میں کیا جانوں تم کیا کہنا چاہتی ہو .... ماں جی کو کہو نا کہ وہ ......!" "ہٹو بھی اب چھوڑ دان پچھلی باتوں کو چلو کھانا کھا لو۔"

"......... دیکھو رانی تمہیں ایک خوشخبری سناتا ہوں مجھے ایک ٹھیکیدار کے پاس تین ماہ کے لئے نوکری مل جانے کی اُمید ہے اگر وہ مان گیا تو پرسوں سے کام پر جانا شروع کر دوں گا۔ مگر کم از کم دس پندرہ مزدوروں کا بھی بندوبست کرنا ہو گا۔ تب ہی مجھے کام مل سکتا ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں یہ بندوبست کسطرح ہو گا ......!"

"کوشش کرنے سے سب کچھ ہو جائے گا۔"

"ہاں بھئی! کچھ نا کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ماتا جی نے کھانا کھا لیا ہے۔"

"ابھی نہیں۔"

"دیکھو رانی میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے۔ انہیں پہلے کھانا کھلا دیا کرو۔"

"کہا تو تھا مگر وہ کہاں مانتی ہیں۔ جب جی چاہے کھاتی ہیں۔ انہیں کوئی روکنا تھوڑے ہی ہے۔"

ایسی ہی باتوں میں دن گذرتے گئے۔ اب ترا کو وہ کام پر ہی جانے لگا تھا۔

مہینے پہ مہینہ پورا ہوتا گیا۔ مگر ٹھیکیدار سے تھوڑا بہت روزمرہ خرچ کے علاوہ کچھ نہیں مل رہا تھا۔ راجو ٹھیکیدار کے ہاں چکر کاٹتے کاٹتے تنگ آچکا تھا۔ مگر اس کی کوئی اُمید بر نہ آتی تھی ٹال مٹول میں ہی مہینے گذرتے گئے۔ اب اُسے نااُمیدی سی ہونے لگی۔ اس کا روزانہ یہی کام رہ گیا تھا۔ صبح ٹھیکیدار کے ہاں جانا اور شام کو لٹکے چہرے سے گھر میں آکر بیٹھ جانا۔ آخر میں تنگ آکر اس نے جانا ہی چھوڑ دیا۔ ایک دن تنہائی میں بیٹھا سوچ میں ڈوب رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑا پلان بنا رہا ہو۔ رانی نے کہا ـــــ

" ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھو ہو سکتا ہے وہ تمہاری مجبوری کو سمجھ جائے۔ آج تین مہینے ہو چکے ہیں اسی چکر میں اور پھر امتحان میں بھی ابھی کچھ ہی دن باقی ہیں . . . . !"

" رانی ـــ" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ رانی نے دیکھا جیسے اس نے یہ بات کہہ کر بہت بڑا گناہ کر دیا ہو ـــــ راجو چپکے سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

وہ چلا جا رہا تھا۔ چلا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کہاں۔ مگر رانی کی بات پہ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک بار مل لیتا ہوں شاید وہ مان جائے۔ ہرج بھی کیا ہے۔ اپنی مزدوری ہی تو مانگنے جانا ہے۔ میں اس سے خیرات تھوڑے ہی مانگ رہا ہوں ـــــ جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا ـــــ ہاں راجو ضرور جاؤ۔ تم نے سمجھا دیا ـــــ لیکن ـــــ اچھا میں جاؤں گا۔ ابھی جاؤں گا ـــــ چلو راجو ـــــ چل تو رہا ہوں۔ لیکن وہ آتے دیکھ کر ہی غائب

ہو جائے گا۔ جواب ملے گا ۔ وہ گھر پر نہیں ہیں ۔ وہی روز مرہ کا جواب —— مگر آج تو وہیں بیٹھ کر انتظار کروں گا ۔ دیکھتا ہوں وہ کب تک باہر نہیں آئے گا —— ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ ٹھیکیدار کے گھر کے پاس رُک گیا ۔ شاید وہ آگے نکل جاتا ۔ لیکن ایک دلی جیسی چیخ نے اسے چونکا دیا ۔ اس نے آگے پیچھے دیکھا کوئی نہ تھا ۔ پھر یہ چیخ —— شاید میرا وہم ہے ۔ دروازہ بند ہے —— چپکے سے دیکھ لیتا ہوں ۔ آواز لگائی تو جواب وہی ملے گا —— وہ اندر نہیں ہیں ۔ دیر سے آئیں گے آپ کل آنا ۔ اس سے بہتر ہے —— پھر ایک چیخ —— یہ تو ٹھیکیدار کے کمرے سے آ رہی ہے ۔ پھر چیخ —— آخر یہ ماجرا کیا ہے ۔ ذرا دیکھوں تو —— نہیں اس طرف سے کوئی دیکھ لے گا ۔ کان لگا کر سننے لگا ۔ اب چیخ کی جگہ سسکیوں کی آواز آ رہی تھی ۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کوئی سسکنے والے کو پچکار رہا ہے اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا ۔

” ٹھہرو —— تم بیٹھ جاؤ پہلے میں دروازہ کھول کر دیکھ لیتا ہوں ۔ “ دروازہ کھلتے ہی راجو کی پہلی نظر ان سسکیوں کی تلاش میں کھو گئی ۔ وہ چونک گیا ۔ سامنے شانتی مالن کی ٹھکی کو دیکھ کر وہ سیدھا کمرے میں داخل ہو گیا ۔

” راجو کاکا ! راجو کاکا ۔ مجھے —— بچاؤ ۔ “

” تم یہاں کس لئے آئی تھیں مالا ؟ “

” اماں جی نے پھولوں کے دو روپے لینے کے لئے بھیجا تھا ۔ گھر پر

جیجاجی آئے ہوئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔۔۔!"
راجو نے گھورتے ہوئے ٹھیکیدار کو دیکھا ۔ ماتھے پر بل لاتے ہوئے
بولا ــــــ
" ٹھیکیدار صاحب ! آپ کے بھی لڑکیاں ہیں اور مالا آپ کی بڑی
لڑکی کی ہم عمر ہو گی - اسے اپنی بیٹی سمجھنا نہیں گوارا نہیں تھا تو پھر گیارہ سالہ
بچّی کے ساتھ ــــــ ایک ایسی کلی کے ساتھ جسے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کیا ہے
اور کیا بن جائے گی ــــــ نوچنا چاہتے ہو. مسلنا چاہتے ہو. اُس کلی کو
پروان چڑھنے سے پہلے ہی ــــــ سوچا ہوتا ٹھیکیدار جی . مالا آپ کے پاس
کیا غرض لے کر آئی تھی ۔ آخر اسے کس ضرورت سے آنا پڑا ۔ اس لئے تا ان کے
یہاں کوئی مہمان آئے ہوئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"
یہ کیا کرنسی نوٹ ؟ تم سمجھتے ہو کہ میں اس راز کو تمہارے ہزار ہزار
کے دو بنڈلوں سے چھپا لوں گا کہ مجھے ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! کہاں چلی
مالا ۔ ٹھہرو ۔ بھاگو نہیں مالا ــــــ ٹھہرو مالا ــــــ مالا رک جاؤ ــــــ رک جاؤ مالا ۔
" سنو راجو ۔" ٹھیکیدار نے کہا ۔
" دیکھ چکا ہوں ۔ سننے کی ضرورت نہیں ۔" راجو نے دونوں بنڈل ٹھیکیدار
کے منہ پر زور سے دے مارے ــــــ میں جا رہا ہوں ــــــ میں نے دیکھ لی تمہاری
کرتوت جسے تم نئے نوٹوں کے بنڈلوں میں چھپانا چاہتے ہو ۔ مالا بھاگتی ہوئی
آگے نکل چکی تھی ــــــ اور راجو سوچتا ہوا سائے کے پیچھے چلا جا رہا تھا ــــــ
رانی اگر تم نے نہ کہا ہوتا تو میں یہاں ــــــ

کتنا بُرا انسان ہے ٹھیکیدار —— اس سے زیادہ برائی اور کیا ہوگی کہ میں بھی خاموشی سے واپس گھر کو لوٹ رہا ہوں۔ مگر میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ امیروں کے پاس پیسہ ہے۔ دولت ہے اور ٹھیکیدار امیر ہے۔ مگر میں خاموش نہیں رہوں گا —— خاموشی سے تو چل رہے ہو۔ لیکن صبح یہ خاموشی نہیں رہے گی۔ اب اس اندھیرے میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں —— تم کیا جانو راجو۔ ان اندھیروں میں کیا کیا نہیں ہوتا —— اور صبح تک پھر یہ اندھیرے تنہائی اختیار کر لیتے ہیں......!

یکایک ایک خاموش گلی میں کسی چیخ نے اس کے خیالوں کو توڑا وہ رُک گیا۔ دیکھا تو اپنی ہی گلی میں کھڑا ہے۔ کان لگا کر سُنا تو سمجھ میں آیا اپنے ہی مکان میں یہ شور ہو رہا ہے۔ دروازے کے پاس چلا گیا تمام محلہ پر خاموشی طاری تھی۔ اُس نے اپنے پڑوس والے مکانوں کی کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ کوئی سُن تو نہیں رہا ہے۔ پھر روشندان کے راستے سے جو رسوئی گھر سے نکلتا تھا۔ اندر چلا گیا۔ اُس نے آہٹ لی۔ سُن پڑا۔ رانی کہہ رہی تھی —— "لعنت ہے ایسے دوست پر جو مدد کرنے کے بہانے سے اُس کی بیوی کو بُری آنکھ سے دیکھے اور پھر......"

"آؤ نا میری جان! پیچھے پیچھے کیوں بھاگتی ہو۔ کون سُنے گا اس وقت تمہاری ان باتوں کو۔ پھر یہ تنہائی اور یہ پلنگ —" اس کے بعد ایک چیخ نکلتے نکلتے دب گئی۔ راجو جلدی سے کمرے میں کودا ——

راکیش رانی کو گلے سے بھینچتے ہوئے اپنے جسم کی پوری طاقت سے پلنگ کی طرف دھکیل رہا تھا۔

راکیش! راجو زور سے گرجا۔

"کون ـــ راجو ـــ راکیش پھٹی پھٹی نظروں سے راجو کو گھورنے لگا۔

"ہاں میں ہوں ـــ راجو؟

"او ـــ راجو ـــ تم آگئے۔

"ہاں۔ میں آگیا ـــ رانی ـــ

راکیش کی پہلوانی۔ راجو کو دیکھتے ہی ٹھنڈی پڑ گئی تھی ـــ اور رانی ـــ دوشاشن کے ہاتھوں سے چھوٹ کر بھٹی اور مسلی ساڑھی کو ٹھیک کرتے ہوئے سسکیاں بھرتے دور کھڑی ہانپ رہی تھی۔

"راجو۔ دیکھ رہے ہو دیکھو اپنے کلجگی دوست کی کرتوت کو؟

"مگر میرے ہوتے تو ـــ یہ ـــ راجو کھا جانے والی نظروں سے راکیش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ـــ

"تمہارے باہر جاتے ہی ـــ ہانپتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے رانی بولی ـــ یہ پاگل کتا گھر میں گھس آیا۔ اس نے شراب پی رکھی تھی اور زور زور سے تمہیں پکار رہا تھا ـــ میں نے بڑے پیار اور عزت سے بٹھایا۔ جلدی جلدی تمہارا دودھ کا گلاس گرم کیا ـــ دودھ کا گلاس جوں ہی پیش کیا۔ اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ کہنے لگا ـــ آج تمہارے دودھ کی نہیں۔ تمہارے حسن کی گرمی کی ضرورت ہے۔ آج اپنے حسن کا جام پلا دو رانی ـــ ذرش

پر بکھرا ہوا دودھ دیکھ رہے ہو راجو — میں نے — میں نے — رانی زور سے رو پڑی ۔"

"راجو مٹھیاں کستے ہوئے خونخوار نظروں سے راکیش کو گھورتے ہوئے بولا۔

تم راکیش نہیں راکھشس ہو میرے دوست ، ذریں لباس میں خبیث روح ہوتی ہے اس کا تجربہ نہ تھا — آج معلوم ہوا کہ اس دنیا میں دوستی کے پردے میں ڈاکو بھی چھپے ہوئے ہیں — تمہارے جیسے دوسرے ڈاکو ٹھیکیدار کا بھی ننگا روپ دیکھ کر آ رہا ہوں ۔ سوچتا تھا رات کے اندھیروں میں ڈاکو اور چور غریبوں کا دھن لوٹتے ہیں اور تم جیسے اچھی صورت اور ریشمی لباس والے امیر ، پرائی بہو بیٹیوں کی عزت اور عصمت پر ڈاکے ڈالتے ہیں ۔ سسکتی ہوئی آہوں چیخوں اور آنسوؤں کو نوٹوں کے ڈھیر میں ڈبو کر پی جاتے ہیں انصاف اور قانون کو خرید لیتے ہیں — او — پرماتما یہ کیا ہو رہا ہے وہ بڈھا خبیث ٹھیکیدار — اپنی پوتی کی ہم عمر لڑکی کو رات کے اندھیروں میں اس کی معصومیت کا گلا دبا کر اپنی ہوس پوری کرنا چاہتا ہے اور تم اپنی ہوس کو اپنی بھابی یا بہن کو اکیلا پا کر —— پوری کرنا چاہتے ہو — راکیش ۔ میں غریب ہوں تم امیر — تم نے دوستی کا جال پھیلایا میں پھنس گیا یہ نہ سمجھا کہ تمہاری امارت کے جال کے نیچے مگر مچھ چھپا ہوا ہے — خیر جانے دو — میں اس لئے ایمان ٹھیکیدار کو بھی چھوڑ آیا ہوں — تمہیں بھی چھوڑ رہا ہوں — تمہارے کئی احسان میری گردن پر ہیں ۔ یہ احسان غریب کی عزت اور خودداری

کو دبا رہے ہیں ۔ جھنجوڑ رہے ہیں ۔ جاؤ چلے جاؤ ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ ـــــ

ٹھیکیدار ـــ کے پاس جاؤ وہ بھی غریبوں کے خون سے بھرا ہوا شراب کا جام پیتا ہے ۔ نوعمر لڑکیوں کی عفت و عصمت لوٹتا ہے اور پھر نوٹوں کے ڈھیروں میں چیختی اور لٹی ہوئی نیم بسمل عصمتوں کو دفنا دیتا ہے ۔ تم بھی اور کوئی میرا جیسا دوست تلاش کر دو ـــ آہوں ـــ سسکیوں کو جام میں ڈبو کر پیتے جاؤ ۔ اور نوٹ بکھیرتے جاؤ میرے دوست جاؤ ـــــ چلے جاؤ ـــــ

● ●

ہمارے ساتھی

ایک بار مجھے دن بھر سلوتری گاؤں میں گھومنے کا موقعہ ملا جو شہر سے آدھ میل کی دوری پر تھا ۔ اس گاؤں کے سارے لڑکے شہر میں ہی آکر پڑھتے تھے ۔ بہاری جو اس وقت سات سال کا ہوا ہو گا ۔ کندھے سے تھیلہ لٹکائے نہ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا پاؤں کی ٹھوکروں سے مٹی پتھر کے چھوٹے چھوٹے کنکروں کو گیند کی طرح اُچھالے آ رہا تھا ۔ نہ جانے کیوں اسے ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنے کو

جی چاہ رہا تھا۔ کیاری سڈول جسم اور آدھ کھلے گلاب کے پھول کی طرح تھا۔ اب وہ میرے نزدیک آگیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ جیسے وہ بے خبری میں کوئی ڈر کی چیز دیکھ کر ٹھٹھک گیا ہو ــــ

"کیوں بھائی سکول سے آرہے ہو ؟ کوئی جواب نہ دیا اُس نے۔ چُپ چاپ مجھے دیکھے جارہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو مُنّے ؟

"آں .... ہیں ...... کچھ نہیں .... آپ ...... !

"تمہارا گھر کہاں ہے مُنّے۔

"وہ سامنے جو درختوں کا جُھنڈ دکھائی دیتا ہے اُس کے بیچ میں ہے. وہ دیکھیئے ایک طرف کی سفید سی دیوار دکھائی دے رہی ہے۔ اب اُس کی جھجک دور ہو چکی تھی۔

"اور کون کون ہیں تمہارے گھر میں ؟

"ہمارے گھر میں ..... بڑے سیٹھ صاحب، دادی، راجیندر کی ماں، راجیندر اور گڈّی۔

"تمہارے پتا جی کیا کرتے ہیں ؟

"پتا جی ؟ ماں کہتی تھی .. وہ میرے جنم سے پہلے ہی دُور چلے گئے تھے ــــ بہت دُور ــــ نہ جانے وہ کیوں نہیں آئے۔ ماں کہتی تھی وہ کبھی نہ کبھی آئیں گے۔

"اور تمہاری ماں ــــ

"ماں —— وہ سال بھر ہوا - بیمار —— ہو گئی — اور — پھر
—پھر ...... !

" اوہ سمجھ گیا —اچھا تو تم آپ سیٹھ صاحب کے ہاں رہتے ہو —

" ہاں —"

" تمہارا نام کیا ہے -

" بہاری -

" کتنی کلاس میں پڑھتے ہو ؟

" دوسری کلاس میں

...... بہت دیر تک میں اس سے باتیں کرتا رہا - یوں محسوس ہوتا تھا ایک ہونہار بچّہ ہے جو وقت پاکر کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا - کاش میں اس کی کچھ مدد کر سکتا -

" کچھ جیب خرچ ملتا ہے بہاری -

" ہاں آٹھ دنوں میں کبھی کبھی -

" تو یہ لو تھوڑے سے پیسے ہیں -

" نہیں - میں نہیں لوں گا - میری ماں نے مجھے کہہ رکھا ہے ...... !

بہاری رک گیا -

" کیا کہہ رکھا ہے تمہاری ماں نے ذرا میں بھی تو سنوں ؟

جس دن وہ بہت بیمار ہو گئی تھیں نا - تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہا -

دیکھو بیٹیا —— شائد اب میں کھلی چنگی نہ ہو سکوں گی۔ ایسا جان پڑتا ہے جیسے تمہارے پتا جی مجھے بلا رہے ہیں۔ دور۔ بہت دور۔ اب مجھے جانا ہی پڑے گا۔ میرے پیچھے کچھ باتوں کا دھیان رکھنا۔ چوری نہ کرنا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ ساتھیوں سے مل کر رہنا اور پڑھائی جی لگا کر کرنا اسی پڑھائی سے دنیا کو پہچان سکو گے۔ سب کچھ جان پاؤ گے۔ کسی کے آگے کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر نہ کچھ مانگنا اور نہ کسی سے مفت میں کوئی چیز لینا۔ یہی میری آخری نصیحت ہے بیٹیا۔ پرماتما تمہیں اچھے راستے پر چلنے کی دھیر بندھائے رکھے۔

وقت بہت ہو چکا تھا۔ بہاری نمستے کہہ کر چلا گیا۔ مگر اس کی تصویر میری آنکھوں میں گھومتی رہی۔ لاکھ کوشش پر بھی میں اُسے نہ بھول سکا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ بہاری کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ میں اس کے ماسٹر سے ملا اور اسے تاکید کی کہ وہ بہاری کی پڑھائی میں جی لگا کر کوشش کرے۔ میں انہی ماسٹر جی کے ذریعے کتنے ہی سال پندرہ روپے ماہوار بہاری کے نام بھیجتا رہا۔ نہ جانے کیوں یہ وظیفہ بھیجتے مجھے اطمینان سا ہو جاتا تھا۔ میری طبیعت پُرسکون ہو جاتی تھی۔ سولہ سال بیت چکے۔ نہ جانے آج تیئیس ۲۳ چوبیس ۲۴ سال کا نوجوان بہاری کس شکل صورت کا ہوگا۔ یہ سوچ کر ماسٹر کے ذریعے ایک فوٹو منگوایا تھا لیکن وہ فوٹو گم ہو گیا۔ مگر فوٹو کے دھندلے نقوش میری آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔ آج بھی بہاری جیسے کسی بچے کو دیکھ کر اس کی یاد ستانے لگتی ہے۔ بہاری سے ملنے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہاری جیسے بچے سپنوں میں غول کے غول آنکھوں کے آگے آ جاتے ہیں۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہتے ہیں ——

بڑے دانی بنے پھرتے ہو، ہم جیسے اناتھ بچوں پر دیا کرتے ہو ۔ اپنی بھری ہوئی تجوریوں سے چند سکے ہماری طرف پھینک دیتے ہو ۔ سمجھتے ہو ۔ ان چند سکوں سے ہم اناتھ بچوں کو ، ماں کی ممتا کا پیار ___ باپ کا لاڈ اور تمہارے اپنے جیسے بچوں کی آزادی پوشش اور کھانا پینا ہمیں مل جائے گا ہمیں بھکاری سمجھ کر تم اناتھ ودیالیہ کھولتے ہو اپنے نام اور یش کے لئے ۔ تاکہ تم بڑے دانی مشہور ہو جاؤ ۔ تم ہم جیسے اناتھ بچوں کے جذبات سے کھیلتے ہو ۔ سمجھتے ہو ۔ تمہاری دولت الٹا گئے بچوں کی زندگی سنوار دے گی ___ جھوٹ ___ فریب ___ یہ سب تمہارا فریب ہے ۔ تم اپنے ادھرم کی کمائی ہوئی دولت میں سے چند سکے ہماری طرف پھینک دینے سے ہمیں نہ ممتا کا پیار دے سکتے ہو نہ اپنے جیسے بچوں کا جیون روپ دے سکتے ہو ۔ یہ فریب ہے ___ فریب ___" تب میں جاگتے ہی ایسا محسوس کرتا ہوں کہ یہ سب فریب ہے ___ فریب ___ ہم اپنے امیرانہ ماحول میں پلے ہوئے بچوں کا جیون روپ اناتھ بچوں کو نہیں دے سکتے ___ نہ پیار ___ اور نہ خلوص کا تحفہ ___ دھن کماتے ہیں ۔ تجوریاں بھرتے ہیں اور ان میں سے چند سکے اناتھ بچوں پر نچھاور کر کے اپنی آتما کو سکھی سمجھتے ہیں ۔ سینکڑوں بچے جن کی صلاحیتیں ابھرتے سورج کی طرح دنیا کو منور کر سکتی ہیں ۔ ایسے ہی ڈوب جاتی ہیں ۔ جیسے ڈوبتا ہوا سورج افق میں غائب ہو جاتا ہے ۔ ہم دھن کماتے ہیں ۔ مگر یہ دھن ہماری تجوریوں میں اپنے ہی سکھ کے کام آتا ہے ۔ پرائے سکھ اور دکھ کی ہمیں پرواہ نہیں ہوتی ۔ پر کیا کروں میرا بھی اب یہی جیون ہے ۔ لیکن

اب میں اس جیون کی دھارا موڑوں گا۔ ان ہی خیالوں میں نہ جانے کب سٹیشن پر پہنچ گیا۔ ریل کی سیٹی سے چونک اُٹھا۔ اور سنبھل کر اُترتے چڑھتے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ ایک جانی پہچانی صورت میرے سامنے سے گذری۔ ایک بھولا ہوا خواب جیسے یاد آگیا ہو۔ مگر یاد نہیں آرہا تھا کب دیکھا ہے۔ بہت سوچا میں نے۔ بہت سر دھنتا رہا۔ میں نے اُسے بُلایا۔

"بھائی صاحب! ذرا سنیئے۔ میں آپ.... آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

چونکتے ہوئے جواب ملا۔

"فرمائیے! کیا کوئی خاص بات ہے۔؟"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بھیّا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ اگر میں بھولتا نہیں تو آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میں کبھی آپ سے ملا ہوں۔ جس سے میرا شک دور ہو جائے ۔۔؟

"اگر میں یہ کہہ دوں کہ تجھ سے ملے تھے۔ میرا خیال بھی رکھتے تھے۔ مجھ سے بڑی ہمدردی بھی رکھتے ہیں مگر اس سے کیا ہوگا۔۔؟" "بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ "خالی ہمدردی ظاہر کرنے سے دنیا کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ کب تک یہ خواب دیکھنے والے دیکھتے رہیں گے۔

"خواب بھی کبھی کبھی حقیقت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔۔

"لیکن حقیقت بھی تو ایک خواب ہی ہے۔ دراصل ہم اُسے سمجھ نہیں پاتے۔ جب سمجھ پاتے ہیں تو کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ہم کامیاب نہیں ہو سکے۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو کہا جاتا ہے کہ یہ سدا

کی رہتی چلی آرہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے ——

"ہاں اور آج تک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کا نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

"بہاری – اب تو جان گئے ہونا۔

"بہاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

"ہاں میں بھی آپ کو پہچان نہیں سکا۔ صرف ماسٹر جی کہتے رہتے تھے ان کی بدولت ہی میں پڑھائی جاری رکھ سکا ہوں۔ وہ گاؤں کی دھندلی یاد —— ایک بار میں سکول سے جا رہا تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ——

"ہاں بہاری میں وہی بدنصیب انسان ہوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ آپ کے وہ سیٹھ صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

"کیا کریں گے جان کر —— بڑی مشکل سے اُس گھر سے نکل پایا ہوں —— آج تک کیا کچھ میرے ساتھ نہیں ہوا۔ میں دہرانا نہیں چاہتا —— اور وہ ملاقات کا دن بھول جانا چاہتا ہوں ——

"تم تو بھول جانا چاہتے ہو لیکن میں سننا چاہتا ہوں – آؤ یہاں کنارے کے بینچ پر بیٹھتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس دن دیر تک میں آپ کی باتوں میں الجھا رہا۔ گھر جانے تک گُپ اندھیرا ہو چکا تھا۔ میرے پہنچتے ہی سیٹھانی جی نے اولے برسانے شروع کر دیئے —— بہت بُرا بھلا کہا —— کہاں رہے تم اتنی دیر تک۔ سب برتن جھوٹے پڑے ہیں اتنا تو خیال رکھا ہوتا اور کبھی کئی کام میں نے کرنے

ہیں ۔ راجندر اور گڈی بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ کوئی برتن صاف نہیں جس میں انہیں کھانا دوں۔ موا ۔۔۔ کام چور ۔۔۔ کھانے کو تو سیر بھر اناج چاہیئے اور کام کرنے پر سانپ سونگھ جاتا ہے۔ اچھا ۔۔۔ جاکر جلدی سے برتن صاف کر ۔۔۔ پھر کبھی دیری سے آیا تو چھت سے الٹا لٹکا دوں گی۔

...."کیا کہتا ۔۔۔ کچھ کہنے کے قابل بھی نہ تھا۔ چپ چاپ برتنوں کے ڈھیر سے الجھ گیا ۔۔۔"

"بہاری! تمہیں ماں بہت تنگ کرتی ہے تو تم بورڈنگ میں ہی رہ جایا کرو نا۔ میں تمہیں ......!

"کیسے جاؤں ۔۔۔ وہاں بھی نہیں جانے دیتے۔ یتیم خانے میں داخل ہونے کے لئے کہتا ہوں تو بھی کہتے ہیں۔ ہمارے نام کو بٹا لگ جائے گا۔ لوگ کہینگے اتنا بڑا سیٹھ ہو کر ۔۔۔ کیا کروں راجندر نہ یہاں سے جانے کی بات ہے نہ رہنے کی۔

بہاری میرے ماتا پتا تمہیں بہت تنگ کرتے ہیں مجھ سے تو ناراض نہیں ہونا۔

"نہیں راجندر تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ تم تو میرے چھوٹے بھائی ہو میرا ہر طرح سے خیال رکھتے ہو۔ میرے ہمدرد تو تم ہی ہو۔ تمہارا پیار ہی تو مجھے سکھ دے رہا ہے۔ نہیں تو میں کب کا بھاگ گیا ہوتا۔

"نہ۔ نہ بہاری بھاگنا نہیں۔ اگر ایسا سوچا تو پڑھ نہیں سکو گے۔ پھر میں بھی تمہارے بغیر کس سے کھیلوں گا۔ باتیں کروں گا۔ کچھ دن اور گالیاں سنتے رہو اور پڑھتے جاؤ ۔۔۔

" پڑھوں بھی کیسے ـــــ گھر آتا ہوں تو کام سے فرصت نہیں ملتی ـــــ اسکول جاتا ہوں تو غریب سمجھ کر اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہوں۔ کسی ماسٹر کو میری پڑھائی سے دلچسپی نہیں ـــــ کسی کے دل میں میرے لئے ہمدردی نہیں۔ سب سکول کے لڑکے مجھ سے جلتے ہیں۔ راجندر تم ہی بتاؤ۔ میں ٹھیک پڑھائی کرتا ہوں۔ سبق یاد رکھتا ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ـــــ میری محنت سے جل کر میرے ساتھی کیوں گھورتے رہتے ہیں۔ جب بھی میں ماسٹر جی کے سوالوں کا ٹھیک جواب دیتا ہوں تو وہ ہونٹ کاٹتے نظر آتے ہیں.......!

" بہاری سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ دیکھتا ہوں کون کون تمہارے ساتھ اڑتے ہیں۔ باقی کام گھر کا جو ہوگا وہ ہم ملکر کر لیا کریں گے۔

" راجندر یہ کام تو صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ تم اگر کرو گے تو تمہارے ہاتھ پھٹ جائیں گے۔ پھر تمہیں کرنے بھی کون دے گا ـــــ

" خیر کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لیا کریں گے۔ اچھا یہ تو بتاؤ آج پک نک پر چلو گے نا؟

" نہیں ـــــ "

" کیوں ـــــ؟ "

" سیٹھانی جی سے کہا تھا۔ وہ نہیں مانتیں کہتی ہیں ـــــ " گھر پر کون رہے گا۔ دیکھو کتنے دنوں سے فرش نہیں دھویا۔ آج فرش صاف کرنا ہے۔

تم دوسری دفعہ چلے جانا ـــ" اور پھر ساتھ کے لڑکے بھی نہیں چاہتے کہ غریب لڑکے پک نک پر جائیں۔ ماسٹروں کو ہم غریبوں سے کیا ملے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو چپاتیاں ساتھ میں ہوں گی۔ وہ بھی دور بیٹھ کر کھانی پڑیں گی۔ پھر بھلا تم ہی بتاؤ کیونکر ہم جا سکتے ہیں ـــ؟

"تمہارے لئے تو میرے پاس پیسے ہیں۔ مگر.....!

"تم چلے جانا راجندر ـــ ہم پھر جائیں گے ـــ

"اگر تم نہیں جاتے تو میں بھی نہیں جاؤں گا ـــ

"نہ ـــ نہ ایسا نہیں کرنا۔ سیٹھ جی مجھ پر ناراض ہوں گے۔ کہیں گے تمہارے ساتھ رہ کر ہمارا لڑکا بھی خراب ہو گیا ہے۔

"بہاری تم بڑے نہیں ہو ـــ بڑے تو میرے ماتا پتا ہیں ـــ جو تمہیں میرا جیسا نہیں سمجھتے ـــ وہ ماسٹر بڑے ہیں جو غریب اور امیر لڑکوں میں فرق سمجھتے ہیں ـــ تم بہت اچھے ہو بہاری! میں نہیں سمجھتا تم میں کس بات کی کمی ہے ـــ بس یہی کہ تمہارے ماں باپ نہیں ہیں ـــ غریب ہو ـــ دیکھو بہاری کتنے بڑے ہیں یہ لوگ جو......!

"راجندر آج پھر تم بہاری کے ساتھ....... چلو آؤ دیر ہو رہی ہے۔ کتنی دیر سے ہم تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں" ماسٹر جی بڑبڑائے۔

"میں پک نک پر نہیں جاؤں گا" راجندر نے کہا ـــ

"کیوں ـــ؟"

"بہاری جو نہیں جا رہا ہے"

"پھر بہاری .... اچھا بھائی مت جاؤ۔" گھورتے ہوئے سب لڑکے اور ماسٹر جی چلے گئے۔

اسی طرح دن گذرتے رہے۔ راجیندر امیر تھا اور ہم سب غریب۔ ہمارے ساتھ پر چرچہ ہونے لگی۔ ماں باپ منع کرتے رہے۔ لیکن راجیندر نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہم غریب اور مجبور لڑکوں کا وہی کرتا دھرتا تھا۔ مگر ایک راجیندر کی ہمدردی سے ہماری تکلیفیں دور تھوڑے ہی ہو سکتی تھیں۔ آہستہ آہستہ سب ساتھی اپنی امیدوں کو دلوں میں دبائے آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت تک پہنچنے سے پہلے ہی اسکول چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسی نے نہ سمجھا ان میں کتنے انجینئر، ڈاکٹر، فلاسفر اور منسٹر بننے کے قابل تھے۔ ـــ کون برداشت کرتا ان کی رہنمائی کو، کون اُن کے دماغ کو پرکھتا کہ وہ کس قابل ہیں ـــ جہاں غریب نوجوانوں کے امیر دماغ کو کون پوچھنے والا ہے؟ جہاں تو غریبوں کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ ان کے جاہل دماغ اور مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہے ـــ میں نہیں سمجھتا گھٹیا امیر دماغ غریب ہونے پر بھی کیوں آگے لائے جاتے ہیں ـــ اور غریب دماغی طور پر امیر ہوتے ہوئے بھی کیوں پیچھے چھوڑ دیئے جاتے ہیں ـــ اور بعد میں کہا جاتا ہے بے چارا بڑا ہونہار ہے اگر آگے تک پڑھ لیتا تو اس نے بڑی ترقی کرنی تھی ـــ اور پھر اُن پر دیا کر کے بڑا احسان جتلا کر، نیم اور منشی لگائے جاتے ہیں۔ کلرک بھرتی کئے جاتے ہیں ـــ بڑا احسان جتلا کر، چھاتی ٹھوک ٹھوک کر کہتے ہیں ہم تمہارے سے ہی تو لڑتے ہیں۔ بس رات دن ہمارا یہی ایک کام ہے.....!

" بھیّا یہ ٹھیک ہے پر، ہم نے یہ سب کچھ دیکھا ہے ۔ محسوس کیا ہے
ہم سے بیتی ہے لیکن دراصل ہم رہ جاتے ہیں ۔ وہ سب کچھ ہم کر نہیں پاتے
جو ہم چاہتے ہیں اس کے لئے ہمیں کچھ کرنا ہوگا ۔ اب یہ داشت کرنے کا وقت
نہیں کہ ہم دیوانوں کی طرح ویرانوں کی خاک چھانتے پھریں —— ہمیں
اب ان وادیوں میں بھی اپنے مقدر کی کھوج کرنی ہے ۔

" دیکھو وقت بتائے گا ہم کیا نہیں کر سکتے ۔

" .... بھیا مجھے بچپن کی باتیں سُننے کی بڑی خواہش تھی ۔
اور آج جو کچھ سُنا اپنے سے جدا نہیں پایا ——

" بھیّا غریبوں کا بھی کوئی بچپن ہوتا ہے ۔ اُن کی ادھوری کہانیاں
لوگ پڑھتے ہیں ۔ سُنتے ہیں ۔ کچھ تھوڑا بہت رد بھی لیتے ہوں گے ۔ لیکن اس
سے غریبوں کا تو کوئی بھلا نہیں ہوتا —— ؟

" ہمیں یہی سوچ کر رُک نہیں جانا ہے اور نہ ہی اب یہ امیر سماج کا ظلم
برداشت کرنا ہے ۔ اس کے لئے ہمیں مل کر کچھ کرنا ہوگا اپنے لئے ۔ اپنے ساتھیوں
کے لئے ۔ اپنے دیش کی ترقی کے لئے یہی ہماری کامیابی ہوگی ۔ ہمیں کچھ کر کے
دکھانا ہوگا ۔ پھر دیکھنا ہمارے بچپن سے دنیا حسد کرے گی ۔ ہمارے جیون کو
بھی ، تواریخ کے صفحات پر جگہ ملے گی ۔ شاعروں کے ہونٹوں پر ہمارے بھی
گیت ہوں گے ۔"

خیر تو اسی طرح لڑتے جھگڑتے ہم نے دسویں کلاس پاس کر لی ۔
اب سیٹھ صاحب کا وچار تھا کہ میں ان کے لالچی کاروبار میں ہاتھ بٹاؤں ۔

اور اس کے بدلے صرف روٹیوں پر پلتا رہوں ۔ نہ جانے امیر لوگ ایسا کیوں سوچتے ہیں ۔ کھانا ۔ کپڑا ملتا رہے گا ۔ تنخواہ کے بدلے ان کے احسان تلے دبتا رہوں گا ۔ سیٹھ جی سماج میں بڑے دھرماتما گنے جاتے تھے ۔ لیکن میں جانتا تھا وہ کیا ہیں ۔ ان کی سختی آج تک میری مجبوری برداشت کرتی رہی ۔ لیکن کب تک ۔ اس گھر میں میری پرورش ایک کتے سے بھی بدتر ہو رہی تھی ۔ کیسے کرتا ان کی نوکری ۔ اپنے ارمانوں کو کیسے کچل سکتا تھا ۔ اپنی نئی دنیا کی امیدوں کو پائمال کر کے ایک دن نہ جانے کیوں گھر سے رات کو باہر رہ گیا ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ راجیندر بھی آج گھر پر نہیں ہے اس پر بہت دور تک جھگڑا پڑا تھا ۔ سیٹھ صاحب کہنے لگے ۔

"میں نہیں چاہتا کہ میرا لڑکا تمہاری دوستی کی بدولت ناکارہ عفو ثابت ہو ۔ اور ۔ تم بھی سن لو راجیندر پھر کبھی میں یہ سننا نہیں چاہتا کہ تم ۔ ایسے لوگوں کی سنگت میں خاندان کا نام ڈبو رہے ہو ۔ سنا تم نے ۔؟

" جی ۔ راجیندر نے جواب دیا ۔ بہاری بھیا کے ماں باپ نہیں ہیں وہ آپ کے ہی زیر سایہ پلتا رہا ۔ بڑھتا رہا اور اب آگے بڑھنے کا بل رکھتا ہے میں نہیں سمجھتا پتا جی ! آپ اپنی دنیا میں کیسے لوگوں کو بسانا چاہتے ہیں ۔ کن لوگوں کو " اپنے " سماج میں لانا چاہتے ہیں ۔ اچھی طرح جان لیجئے پتا جی ۔ میں بہاری کو اپنا بھائی اور ساتھی سمجھتا ہوں ۔ ہمارا ساتھ اٹوٹ ہے ہم جینگے تو اکٹھے مریں گے تو اکٹھے !

سیٹھ نے آگ بگولا ہو کر لاٹھی اٹھائی ۔ مگر لاٹھی برسنے سے

پہلے ہی ہم دونوں بھاگ نکلے اُس گھر سے۔ جہاں میرا پدقسمتی بچپن گذرا تھا فاقے کئے جھڑکیاں سہیں زخمی ہاتھوں سے برتن دھوئے اور کئی بار سیٹھانی کے جھاڑو کی مار کھا کر بھی چپکا ہو رہا۔ یہ سب کچھ تھے دماغ کی اُبھرتی صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لئے مٹا ڈالنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں۔ میری دماغی جوت ایسی طوفانی ہواؤں کے مقابلہ میں اور بھی چمک اُٹھی۔ میں اپنے ساتھ راجیندر کو بھی گھسیٹتا رہا۔ اب ہمارے سامنے زندگی کی عملی راتیں کھلی تھیں۔ اپنے دماغوں پر بھروسہ تھا۔ مدتوں پردیس کی خاک چھانتے پھرے مگر آگے کی تعلیم پانے کا جنون کم نہ ہوا۔؟

بڑی مشکلوں سے ایک کالج میں داخلہ ملا۔ اور اس طرح میں نے ایم۔ اے اور راجیندر نے بی۔ اے ٹی کی یونیورسٹی ڈگری حاصل کی۔۔۔

"بہت خوب! پیاری تمہاری مصیبت بھری داستان کسی فرصت کی محتاج ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تمہیں پاکر من کی مراد پالی ہے۔ اچھا آؤ۔ امرتسر جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ رہی ہے۔ آؤ میرے ساتھ آؤ؟ اُو۔۔۔ تم۔۔۔ رُک کیوں گئے؟

"نہیں بھیا۔ میرا راستہ اور ہے تمہارا اور۔۔۔ میں سرمایہ دار دنیا کی بڑی توندوں والے سیٹھوں کا مارا ہوا ہوں۔۔۔ تم بھی ایسے ہی سیٹھوں کی صف سے ہو گئے۔ میں تعلیم پاکر اپنے دبے ہوئے بے کس بے سہارا ساتھیوں۔۔۔ پہاڑ کے بھوکے بچوں کی دماغی صلاحیتوں کو اُبھانے اُجاگر کرنے کا پرن لے چکا ہوں۔ میرے پاس دھن نہیں، پر دان چڑھتی جوانی

— دولے — اُمنگیں اور اعلےٰ تعلیم ہے۔ میں اِن ہی ہتھیاروں سے لڑوں گا سرمایہ دارانہ سماج کی اُس ستم رانی کو مٹا کر ہی دم لوں گا جو امیر غریب بچوں میں فرق روا رکھ رہی ہے —

میں بے اختیار ہنس پڑا ۔ بہاری یہ تم سے کس نے کہا ہے کہ میں سیٹھ ہوں ۔ میں جو کچھ ہوں وہی دکھانے کے لئے تمہیں ساتھ لے جا رہا ہوں آؤ — چلیے — آؤ ۔

فضا میں ریل کی الوداعی سیٹی گونجی اور رینگتی ریل نے سٹیشن چھوڑ دیا ۔

" ہیں راجندر ۔ یہاں ۔ تم ......

" ہاں بہاری ان ہی بھائی صاحب کی مہربانی ہے رہنے کا ٹھکانہ ملا ہے ۔

" مگر تم یہاں کیسے آ پہنچے راجندر ؟

" ٹھہرو — میں بتاتا ہوں — یہاں پاس ہی ودھوا آشرم کھلا ہے آشرم کے بچے سکولوں میں تعلیم پانے کا بدل نہیں چکا سکتے ۔ راجندر بابو نے اپنی مفت خدمات دینی قبول کی ہیں ۔ آشرم میں ان کے رہنے کا پربندھ نہ ہو سکا ۔ اس لئے ......

" تو گویا اس کا مطلب ہے بہاری میری بات کاٹتے بولا — آپ ودھوا آشرم کے پردھان ہیں ۔

" ارے نہیں بھائی — میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا — نہ میں کسی آشرم کا پردھان ہوں ۔ نہ میرا کسی آشرم سے تعلق ہے ۔ میرا بچپن بھی تمہارے سے

جیسا درد سے بھرپور بچپن گذرا ہے۔ یہاں میرا دُور کا رشتہ دار رہتا تھا وہ لاولد مر گیا۔ اس کی وصیت کے مطابق مجھے اُس کی تمام جائیداد کا مالک بنا دیا گیا۔ نہ میں گرہستی ہوں نہ دنیادار، سنیاس بھی نہیں لے رکھا ہے۔ ہاں پہلو میں ایک دردمند دل ضرور دھڑکتا ہے جس کو لیکر دُور دُور کے پہاڑوں، وادیوں، دیہاتوں اور گاؤں میں گھومتا رہتا ہوں۔ پونچھ کی وادی میں میرے ننھیال ہیں۔ مدتوں ننھیال میں رہنے کا وقت ملا۔ تو تم سے وہیں ملاقات ہو گئی۔ تمہاری صورت سیرت یا پچھلے جنم کی کشش کی بات کہوں یا دل پر چوٹ کا نام دوں اس ملاقات کے بعد تمہارے جیسے بچوں کی تلاش اور مدد کا بیڑا اٹھا لیا۔ مگر دل کے لاابالی پن کا کیا کروں سوچتا ہوں۔ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ ہر وقت تم میں ہی دھیان لگا رہتا ہے۔ شکر ہے من کی آشا پوری ہوئی اور تم مل گئے۔ میں تمہیں چھوٹا بھائی یا بیٹا سمجھ کر یہ امانت سپرد کرتا ہوں۔ یہ چابیاں اس شاندار دو منزلہ بلڈنگ کی ہیں اور یہ دس ہزار بنک بیلنس کی چیک بک ہے تم سیٹھوں سے انتقام لینا چاہتے ہو۔ یہ انتقام تبھی پُورا ہو گا جب تم دونو ملکر دیش کے کونہ کونہ میں گھوم کر اپنے جیسے اناتھ بچوں کے بچپن کو ماتا کا پیار دو۔ انہیں اپنے آشرم میں پناہ دیکر انہیں محسوس نہ ہونے دو کہ وہ سیٹھوں کے بچے ہیں یا اناتھ غریبوں کے۔ انہیں اعلےٰ تعلیم دو اور دیش سیوا کے کاموں میں لگاؤ۔ قول دو کیا یہ پرن تم دونوں نبھانے کے لئے تیار ہو۔

بالکل تیار ہیں بھیا۔

شری پُشکر ایم - اے

" تو بہت اچھا — یہ لو — قانونی وصیت نامہ بھی تمہارے نام کا تیار ہے۔

" لیکن آپ کہاں چلے ؟

" گھومنے ؟ پوچھ کے اونچے پربتوں اور کل کل کرتی ندیوں کے دیش میں۔ جہاں ان بنوں میں دیوتاؤں کا پیار میری راہ دیکھ رہا ہے : وہاں جہاں پر پرکرتی کی رنگین بہاریں چھائی رہتی ہیں۔ جہاں چاندی کے چشمے جھر جھر کرتے آبشار پھولوں کے پتو بن اور دیوتاؤں کے نواس کے ستھان ہیں — میرا آشیرباد تمہارے ساتھ ہے۔ بھگوان تمہاری حرکت میں برکت دے۔ تاکہ اس برکت سے تم اپنے ساتھیوں کا بچپن خوشیوں سے بھرپور کر سکو "

••

"انتقام"

پنڈت مدن لال نے جوں ہی "بل" پر دستخط کئے، ہیرا لال ورما نے چپکے سے بیرے کو دس روپے "ٹپ" کئے؟

بیرے نے دس کا نوٹ دو انگلیوں میں یوں تھاما جیسے یہ نوٹ اُس نے موروثی حق کا پایا ہو۔ وہ نہ مُسکرایا۔ نہ جھکا۔ ہیرا لال کی طرف معنی خیز نظروں سے گھورتا بل لیکر چلا گیا۔ ٹیبل پر گلاسوں میں وسکی کے آخری قطرے تھکے رہے تھے۔

اور گرینڈ ہوٹل کے ڈرائینگ ہال میں گیتوں اور قہقہوں کے درمیان

جام پر جام ٹکرا رہے تھے -؟
کلاک نے گیارہ بجائے . ہوٹل کے پردے سمٹنے لگے -
آج مدن لال نے پورے تین پیگ اندازے سے باہر پئے تھے -
اور ہیرالال نے دو - ہیرالال پینے کی بجائے کھانے پر زیادہ یقین رکھتا تھا -

دروازے میں کھڑے کھڑے - مدن لال نے سنہری سگریٹ کیس نکالا - ہیرالال کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے اسے جھجکی سی آگئی —
ہیرالال زیرِ لب مسکرا اٹھا -
" پنڈت جی آج تو .... کچھ ......
" کیا کہہ رہے ہو - پنڈت جی بل کھا گئے گیا - س - س سمجھتے ہو -
ز - ز - زیادہ پی گیا ہوں - ش - ش - شرط - پہ - پہ - پر ابھی دو بوتلیں خ - خ خالی کر سکتا ہوں —
اور پنڈت جی کی کانپتی انگلیاں ماچس کی ڈبیہ پر ماچس پر ماچس رگڑے جا رہی تھیں - لیکن یہ کیا - جیسے ایک بھی نہیں - ڈیم کہہ کر ڈبیہ نیچے پھینک دی — ہیرالال نے لائیٹر جلایا - دونوں سگریٹ سلگ اٹھے - ہیرا لال نے مسکراتے ہوئے ماچس کی ڈبیہ اٹھائی ، تیلوں کے سرے الٹے رخ رگڑے گئے تھے جو نہ جلنے پر ڈیم کا خطاب پا کر نیچے پھینکے گئے - کون کہہ سکتا ہے - پنڈت جی زیادہ پی کر بہک گئے ہیں -
سامنے سڑک کے کنارے کار کھڑی تھی - ہیرالال نے لڑکھڑاتے

مدن لال کو سہارا دے کر کار میں بٹھایا۔ ہوٹل کے بیرے نے پلاسٹک
کے تھیلے میں لپٹی ہوئی بوتل آگے کی سیٹ پر رکھ دی۔ ہیرالال نے سو روپیہ
کا نوٹ دیا۔

"پرینچ نہیں ہے صاحب! دوسرے لمحہ میں ہیرالال کی معنی خیز
مسکراہٹ کا راز پاکر بیرا چپ چاپ چلا گیا۔ کار ہچکولے کھاتی۔ آر
پار کی نالیوں کے کنارے چھوٹی تیزی سے چل پڑی۔ کون کہہ سکتا ہے آج
ہیرالال کے ہاتھوں میں سٹرنگ کی "لغزش" شرابی کی بھول چوک کا
نتیجہ ہو سکتی ہے۔

ہارن کی آواز پر دروازے کے پٹ کھل گئے۔ پنڈت مدن لال پچھلی
سیٹ پر بیٹھے جھپکیاں لے رہے تھے۔ ہیرالال اور کامنی نے گھسیٹنے کے
سے ڈھنگ سے تھام کر پنڈت جی کو بہ مشکل تمام خواب گاہ کے پلنگ تک
پہنچایا۔ پنڈت جی کو ابکائی پر ابکائی آ رہی تھی اور سانس رُک رُک کر
چل رہا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو گھور رہے
تھے چہرے پہ پسینے کے قطرے تھر رہے تھے۔ بولنے کی کوشش کے باوجود
کچھ نہ بول سکتے تھے۔

کامنی یہ حالت دیکھ کر کانپ اُٹھی۔ پلکوں پر آنسو تھر تھرانے لگے۔
ہیرالال نہ ہوتا تو پھوٹ پھوٹ کر رو اُٹھتی ۔۔۔ "ڈیڈی یہ کیا ۔۔۔ اس
سے آگے بول نہ سکی۔ جیسے کسی نے گلا پکڑ لیا ہو۔

ہیرالال نے پنڈت جی کو سنبھالا دیا۔ بوٹ اُتارے۔ بستر پر پہلو کے
بل لٹایا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور تولیہ سے پسینہ پونچھا۔

مدن لال کھوکھلی سی آواز میں بڑبڑائے ـــ جا ـ جا جانتے ہو ـ
میں ـ میں کون ہوں ـ یہ ـ یہ پنڈت مدن لال جہ ـ جہ جج ـ جج جج
جیل بھیجوں گا ـ لاؤ ـ بل لاؤ ـــ ایک ہزار ـــ دو ہزار ۔۔۔۔۔۔

ہیرالال نے پاس ہی کھڑی کامنی کو نمک ملا گرم پانی ـــ یا نیموں کا
عرق لانے کو کہا۔ کامنی جیسے چونک سی اُٹھی ۔ رسوئی گھر کی طرف لپکی ـ کامنی
کو جاتے دیکھ کر ہیرالال کو شراب کا نشہ اُترتا سا معلوم ہوا ـــ اف یہ
کامنی کسی سنگتراش کے بنے ہوئے سنگ مرمر کے بت سے کبھی حسین بنے ـ
سرو قد چال میں خاندانی وقار اور انداز میں متانت جیسے کوئی ملکہ ہو ـــ
میں نے آج تک اس کے غنچہ دہن سے کوئی اونچی بات نہیں سنی ۔ کبھی اونچے
قہقہے لگاتے نہیں دیکھا۔ کتنا خیال رکھتی ہے اپنے باپ کا اور اپنے خاندانی
وقار کا ـــ ادھر پنڈت جی اس عمر میں سب کچھ بھول کر ہر شام جام
کے کتنے رسیا ہیں ـــ کامنی نیموں کے عرق کا گلاس لے آئی۔

" لیجئے۔ نیمو کا عرق ہے۔

ہیں یہ کیا گلاس لیتے ہیرالال کی کلائی پر دو ـ آنسو ـــ دو قطرے
کیوں ٹپک ـ پڑے جلتے قطرے ۔ جیسے کسی نے کلائی پر دو انگارے رکھ دیئے
ہوں ۔ کتنے گرم ہیں کامنی کے آنسو۔

ہیرالال گلاس ہاتھ میں لئے ان چمکتے قطروں کو گھورتے نہ جانے کیوں

خیالوں میں کھو گیا ہاتھ میں پیا گلاس لرز رہا تھا۔

اور سامنے کھڑی کامنی ہیرا لال کی مخمور نگاہوں میں جیسے دُور کی دُھند میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ اور کامنی کی دھندلی پرچھائیوں میں نیا ہیولا ایک روتی دوشیزہ کا چہرہ اُبھر رہا تھا۔ ہیرا لال کی آنکھیں ڈبڈبا اٹھیں۔

"چاچا — ہیرا لال جیسے نیند سے جاگ اُٹھا۔

مدن لال کھلے منہ چت لیٹا ہوا خراٹے بھر رہا تھا۔

"کامنی — اب اس لیمو کی ضرورت نہیں۔ جج صاحب سو رہے ہیں انہیں سونے دو۔ ہیرا لال نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے کہا۔

"لیکن — چاچا — ہر شام ....

ہیرا لال۔ جیسے آگے نہ سن سکا۔ ہر رات اور ہر شام انہیں گھر سے لیجا کر رات کے بارہ بجے گھر آکر چھوڑنے والا کون ہے۔ ہیرا لال۔ ایک دن کی بات نہیں آج تین مہینوں سے یہ سلسلہ چل رہا ہے اور ہر رات کامنی کو ان دونوں کی آمد کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ٹھیک وقت پر دونوں کو ہیرا لال کی کار دروازے پر لاکر چھوڑ دیتی ہے۔ مگر کس حالت میں — کیا یہ گناہ ہیرا لال کا ہے یا مدن لال کی ہوس خام کا۔ ہیرا لال دل ہی دل میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

ہیرا لال اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے محسوس کیا اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہیں اور زبان تالو سے لگی سوکھ رہی ہے۔

" میں چلتا ہوں۔ بیٹی ۔ تم بھی کچھ کھالو ۔ انہیں آرام سے لیٹا رہنے دو ۔ جسم اپنے آپ ......

" آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں چاچا ۔ التجائی لہجہ میں حکم کا تاثر بھی جھلک رہا تھا۔ اس دردبھری سریلی آواز میں کتنی مٹھاس تھی جیسے دور سے چاندی کی گھنٹی کا نغمہ لطیف کانوں میں رس گھول رہا ہو۔ جواب میں ہیرالال کچھ کہہ نہ سکا زبان رُک سی گئی ۔ سوکھا سا قہقہہ اُگلتے بولا۔ کل کہوں گا ۔

آرام دہ مخملی صوفہ کے ساتھ لگی ہاتھی دانت کی تپائی پر بوتل اور گلاس ۔ عبداللہ سگریٹ کا پیکٹ اور ہیرالال کی سنہری عینک پڑی تھی۔ دوسری تپائی پر انڈے اور نہ جانے کن چیزوں سے اٹی ہوئی تھی ٹائم پیس کی سوئیاں رات کے دو بجا رہی تھیں ۔ ہیرالال نے دو بار گلاس اٹھایا مگر ہونٹوں تک لے جانے سے پہلے ہی پھر رکھ دیا ۔ آج دوسرا پیگ پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا سگریٹ پر سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولوں میں وہ ماضی کے خوابوں میں ڈوب رہا تھا۔ کلائی پر ٹپکے ۔ کامنی کے دو آنسوؤں کی گرمی نے اُس کے دل و دماغ میں جیسے آگ سی لگا رکھی تھی ۔ وہ بڑبڑایا۔

کامنی ۔ یہ تمہارے آنسو ۔ دو گرم آنسو ۔ ٹھیک وہیں گرے ۔ جہاں آج سے بارہ سال پہلے ۔ میری بہن ۔ میری چھوٹی بہن کے دو گرم

آنسو ٹپکے تھے ـــ تم نے یہ کیا کیا کامنی - پرانے زخم کے کھرنڈ ہی ادھیڑ ڈالے - یہ زخم انتقام، میری چھوٹی بہن شیلا کے لہو کا انتقام مانگ رہے ہیں ـــ ہاں یہ انتقام پورا ہوگا - اس کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے شیلا بہن ـــ پرماتما کا انصاف اندھے کی لاٹھی نہیں یہ وقت پر ہوگا - میری کلائی پر ٹپکے ہوئے آنسو ـــ بیکار نہیں جائینگے - یہ - آنسو - یہ دو گرم آنسو - اُبلتے گرم پانی کے وہ چشمے ہیں جن میں مدن لال ڈوب جائے گا ـــ وہ ڈوبتے چلا جائے گا ـــ روئے گا - مگر ڈوب جانے سے اس کے گناہ دُھل جائینگے -

---

آج برسات کی شام قوس قزح کی سی رنگین شام تھی - ہیرا لال کی فرمائش پر نئے نئے کھانوں سے بھری پلیٹوں پر پلیٹیں آرہی تھیں - ڈائنگ ہال سے قہقہوں اور گیتوں کی طوفانی لہریں کیبن سے ٹکرا رہی تھیں ـــ پنڈت مدن لال شاید آج ساون کے بادلوں کی طرح پینے اور جھومنے کے موڈ میں تھے -

آج ہیرا لال کی گرفت نے بھی پنڈت جی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی وہ کھا کم پی زیادہ رہے تھے اور ہیرا لال پی کم کھا زیادہ رہا تھا - رات گہری ہو چلی تھی اور اس گہرائی کے ساتھ ساتھ پنڈت جی کی پیاس بھی بجھتی چلی تھی گلاس میں پڑی سنہری وسکی کے گھونٹ کم بھرے جا رہے تھے اور بھرے گلاس زیادہ چھلکائے جاتے تھے - پنڈت جی

کی چھچھاہٹ بے جوڑ جملوں تک آپہنچی تھی ۔ اور ہیرالال جیسے بجھا بجھا سا بیٹھا دل رکھنے کی خاطر پینے میں ساتھ دے رہا تھا ۔ پنڈت جی کی خمار آلودہ آنکھیں موندی چلی گئیں ۔ ہیرالال نے جھنجھوڑا ۔

" پنڈت جی اُٹھیئے ۔ گیارہ بج رہے ہیں ۔

گیارہ بجے گرینڈ ہوٹل بند ہونے کا وقت تھا ۔ پنڈت جی ۔ لڑکھڑاتے قدموں اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ دونوں کیبن سے نکلکر ڈائننگ ہال میں پہنچے چاروں طرف جگ مگ کرتی بجلی کی روشنی میں تتلیاں اور تیز ٹیبلوں کے گرد بیٹھے جھوم رہے تھے ۔ ریشمی کامدار ساڑھیاں رنگین لپ سٹک انداز کے بال ۔ نئے فیشن کی ٹائیاں اور پتلونوں سے ہال بھرا پڑا تھا ۔

پنڈت جی ہیرالال کے کندھے سے لگے جوں ہی ہال میں پہنچے ۔ کئی شناسا آنکھیں پنڈت جی کی طرف اُٹھ گئیں ۔ آداب عرض کی ۔ ایک دو آوازیں بھی اُبھریں اور کئی ایک دبے قہقہے بھی بلند ہوئے ۔ پُرانے شناسا پنڈت جی کو ایک شرابی کے روپ میں حیرت سے پہلی بار دیکھ رہے تھے ان میں کئی پرانے وکیل اور بیرسٹر بھی تھے ۔ ہیرالال ، کی بے چین نگاہیں چاروں طرف کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں ۔ موقعہ پاکر وہ چپکے سے ہوٹل کے کوئنٹر تک پھر ہوٹل کے کچن میں گھس گئے ۔ بار روم میں مینیجر سے سرگوشی ہوئی ۔ پھر وہی بیرا نمودار ہوا ۔ آنکھوں ہی آنکھوں اُس سے کچھ باتیں ہوئیں ۔ تب ہیرالال جی پنڈت جی کو چھوڑ کر نہ جانے کس گوشہ میں گم ہوگئے ۔ بیرے نے جھومتے ہوئے پنڈت جی

کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

" صاحب یہ آپ کے بل ہیں رقم دلوائیے۔؟

" ر۔ ر۔ رقم — کہ کتنی رقم ہے! —

" یہ دیکھئیے۔ کل دو ہزار چھ سو بارہ روپے ۹ آنے ہیں۔ لائیے نکالئے رقم —

" ر۔ ر۔ رقم ابھی — چاہئیے ابھی — جاؤ — ابھی نہیں ہے۔

" میں کہتا ہوں پنڈت جی سیدھی طرح رقم نکالئیے۔

بیرے کے سخت ہاتھوں نے لڑکھڑاتے پنڈت جی کے کندھوں کو جھنجوڑا۔ پنڈت جی کی خمار آلودہ موندھی آنکھیں کھل گئیں۔ ابرو پھڑک اٹھے۔ چہرہ تمتما اٹھا۔

" قہ۔ قہ کیا بک رہے ہو۔ بدتمیز — تمیز سے یہ بات کرو۔

" میں کہتا ہوں آج بل کی رقم چکائے بغیر جانے نہ پاؤ گے۔ سمجھے جناب۔

" ج۔ جانتے نہیں مجھے۔ پرے ہٹ کر بات کرو۔ ج۔ ج جیل بھیجدوں گا۔"

" ہیرا ہنس پڑا۔ جج صاحب۔ مجھے نہیں۔ تمہیں جیل جانا پڑے گا بھلا چاہتے ہو تو چپکے سے رقم نکالو — ورنہ —

" ور۔ ورنہ کیا ہوگا۔ ہٹ جاؤ میرا راستہ چھوڑ دو۔" پنڈت جی کے لرزتے ہاتھ نے جھکاتا تا مگر بدتمیز بیرے نے جج صاحب کے تانے لگے

کے جواب میں دو ہاتھ جھوڑ ہی دیئے۔ ٹائی کی گرہ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ پنڈت جی کی آنکھیں اُبل آئیں اور حلق سے کراہنے کی آواز نکلی۔ تمام ہال میں شور مچ گیا۔ مینیجر دوڑا دوڑا آیا۔ کیا ہوا کیا ہوا کی آوازوں میں کھگدڑ سی مچ گئی۔ چاروں طرف سے اس بدتمیزی کی وجہ جاننے کا شور بلند ہوا۔ مینیجر متانت سے بولا۔

"صاحبان ۔ جج صاحب تین ماہ سے ہمارے بار کے بل چکائے بغیر چلے جاتے رہے ہیں۔ جب بھی بل چکائے جانے کا مطالبہ ہوا یہ بہت جلد ادائیگی کا وعدہ کرکے ٹال دیتے رہے۔ آخر ہم لوگ کب تک انتظار کرتے رہتے۔ یہ دیکھئیے ان تمام بلوں پر ان کے دستخط موجود ہیں ۔ پوچھئیے ان ہی سے یہ درست ہے یا نہیں ۔"

بیرے کی دو تھپیڑوں سے پنڈت مدن لال کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ ٹائی کی گرہ ہی نہیں قمیص کا گریباں بھی پھٹ چکا تھا۔ دھیمی ہنسی اب بلند قہقہوں اور طنزیہ جملوں میں بدل چکی تھی۔ پنڈت مدن لال کو یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے بھرے میلے میں انہیں ننگا کر دیا گیا ہو۔

کاش پاؤں تلے زمین پھٹ جائے تو اس میں سما جاؤں۔ کیا معلوم تھا۔ یہ عیاشی ایک دن اتنی ذلت کا باعث ہو گی۔ پھر مجھے جناب عالی، کے خطاب سے بلانے والوں کے سامنے۔ یہ بے عزتی؟

مدن لال کا ذہن اس اچانک حادثہ سے جھنجلا اٹھا۔!

کم بخت! بیرا اور کبھی ولیم ؟ گھورا لال لال دیدے نکالے یہ

جھٹکا دے رہا تھا۔

"ہونہہ - یہاں ساری جمی وجی دھری رہ جائے گی۔ نکالو روپے - بدبخت شرابی؟

ہاں - میں بدبخت شرابی ہوں - جو کبھی جج تھا - انصاف کی اونچی کرسی پر بیٹھ کر کتنے ہی بدبخت شرابیوں کو جیل کی ہوا کھلا چکا تھا آج وہی جج — بدبخت شرابی! کم ظرف بیرا کے گھونسوں سے اپنی درگت بنوا رہا ہے۔ شراب کے جوش میں اُبلتے ہوئے غصّہ کو - ناتوانی اور بے بسی نے بھیگی بلی بنا رکھا تھا - جو شکاری کتّے کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی ہو - آنکھوں سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کی دھارا بہہ نکلی —

"ہیں - مجھے جانے دو - بھائی — کل صبح روپے آجائیں گے۔ مدن لال نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"صبح نہیں - ابھی - ابھی لے کر چھوڑوں گا۔

بیرا گرجا؟ تماش بینوں کی صف سے دو پرانے وکیل آگے بڑھے۔

"مینیجر صاحب - بہت ہو چکی۔ انہیں جانے دیجئے - معزز آدمی ہیں۔ روپے ڈوب نہیں سکتے؟ یہ سفارش کرتے کرتے وہ دونو دبے ہونٹوں ہنس بھی رہے تھے۔

مینیجر نے آنکھ کا اشارہ کیا - بیرے نے گرفت چھوڑ دی —

پیٹھ پر گھونسہ جماتے بولا۔

"جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ جا کر! ندی کی باڑھ میں ڈوب مرو! اپنے باپ دادا کی بار سمجھ کر ردستان سے پینے آجایا کرتا تھا۔

— ندی کی طوفانی باڑھ میں ڈوب مروں؟ — ٹھیک کہا بیرانے۔ بے عزت زندگی سے حرام موت مرنا لاکھ درجے اچھا ہے۔ ندی کی باڑھ میں مجھے ڈوب کر مرنا چاہیئے۔ ڈوبنے میں ہی ایسی زندگی کا رفت گناہوں کا کفارہ ہے۔

ندی میں برسات کی باڑھ کا طوفان زوروں پر تھا طوفانی لہریں اچھل اچھل کر کناروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ آسمان پر پورنماشی کا چاند اور برسات کے بادل آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کبھی چاند چھپ جاتا۔ کبھی اجالا۔ کبھی اندھیرا۔ اس اجالے اندھیرے کے کھیل میں طوفانی ندی گرج رہی تھی۔ اس کی اچھلتی لہروں میں چاند کی کرنیں تلواروں کی باڑھ سی بن کر چمک اٹھتیں۔ اور پھر ڈوب جاتیں ان تلواروں کی باڑھ۔ کی طرف۔ ایک لڑکھڑاتا سایہ بڑھ رہا تھا۔ ریت اور پتھروں میں سے ٹھوکریں کھاتا رینگ کر چلتا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر — کنارے کی لہروں میں ایک قدم دوسرا قدم — ابر تلے کا چاند نکل آیا۔ ہٹتی ہوئی تیز کرنوں نے سرچ لائیٹ پھینکی.. ایک دوسرا سایہ پہلے سایہ کے پیچھے بے تحاشہ

بھاگتا دوڑتا چلا آرہا تھا۔ ندی کی شور فضا میں ایک چیخ ایک تیز چیخ گونجی۔

"ڈیڈی"؟

اور تب دوسرا سایہ پہلے سایہ کے ساتھ سایہ لپٹے۔ گڈ مڈ سے ہوتے ہوئے ندی کی چمکتی تلواروں کی باڑ میں گم ہوتے نظر آئے۔ چاند پر بادل چھا گئے۔ عین اسی وقت ندی کے نچلے کنارے سے تیسرا سایہ اچھلا۔ اور تیزی سے تیرتا اچھلتی لہروں میں سے دونوں سایوں کو گھسیٹ کر کنارے پر لے آیا۔

بادل ہٹ گئے۔ چاند کی تیز کرنوں میں دونوں سائے مدن لال اور کامنی؟ ریت کے فرش پر پڑے سسک رہے تھے۔ مدن لال کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اور کامنی بے ہوش سی تھی۔ اور کھڑے کھڑے ہانپنے والا تیسرا سایہ ہوٹل کا وہی نا لکار بیرا تھا۔

"ڈیڈی۔ طبیعت کیسی ہے۔

"میں۔ میں کہاں ہوں؟

"اپنے گھر میں ڈیڈی؟

"اپنے گھر میں۔ اور تم ہو کامنی — یہ میرا سر کیوں دکھ رہا ہے، یہ پیشانی پر کیسی پٹی بندھی ہے۔

"کچھ نہیں چوٹ آئی ہے۔ ڈیڈی۔ پتھروں سے؟

" پتھروں سے - ہاں ٹھیک ہے - میں تو ڈوبنے گیا تھا - کامنی میں تو ڈوب رہا تھا - لہروں میں پتھر بہہ رہے تھے - ان بہتے پتھروں میں جیسے کسی نے جکڑ لیا ــــ وہ ــــ وہ ــــ کون -

" وہ میں تھی ڈیڈی -

" تم -

" ہاں ڈیڈی میں تھی ــــ میں نے آپ کو کمر سے پکڑ رکھا تھا ہم دونوں دور تک بہتے چلے گئے پھر ــــ ایک نیک انسان نے ہمیں ڈوبنے سے بچا کر کنارے لگا یا ــــ اور ایک تانگے میں بٹھا کر گھر پہنچا یا - ماتھے کی چوٹ سے خون بہہ رہا تھا آپ بیہوش تھے -

" کون تھا وہ ؟

" ہوٹل کا بیرا !

" بیرا ؟

" ہاں - ڈیڈی ــــ یہ وہی بیرا تھا جو مجھے بلا کر لے گیا تھا -

" بلا کر لے گیا تھا - کہاں ہوٹل میں یا ندی کنارے ؟

" نہیں - ڈیڈی پھر کہوں گی ــــ آپ ندی کے کنارے کیوں چلے گئے تھے ڈیڈی ؟

مدن لال کے ذہن کے پردوں کو جھٹکا سا لگا - گذرے ہوئے واقعات آنکھوں کے آگے گھوم گئے - پُر سوز لہجے میں بولے -

" کامنی ہوٹل میں میری عزت سے کھیلا گیا - مجھے دھکے دیئے گئے -

یہ میرے پھٹے کپڑے ۔ کاش میں ڈوبا ہوتا ۔ مجھے ڈوبنے دیا ہوتا کامنی ۔

کامنی کی سسکیاں اونچی لے میں بدل گئیں ۔

" ڈیڈی مجھے بھی بے عزت کیا گیا ۔ مجھے بھی دھکے دیئے گئے ۔ رسیوں سے جکڑا گیا ۔ اور پھر ۔ کامنی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی ؟

" یہ سب کچھ کیسے ہو گیا کامنی ۔ مدن لال سر پر ہاتھ پھیرتے پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئے " کامنی باپ کے گلے میں باہیں ڈال کر اور بھی زور زور سے چلّا اٹھی ۔ مدن لال کی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں ۔ باپ بیٹی کے آنسو ۔ گنگا جمنا کا سنگم بن گئے ۔ دھیرے دھیرے آنسو پونچھتے ہوئے کامنی نے کہنا شروع کیا ۔

" میں آپ کا انتظار کر رہی تھی دس بجے ہوٹل کے بیرہ نے آکر کہا کہ آپ کار ٹکرانے کے حادثہ میں زخمی ہو گئے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں ۔ میں بے قرار ہو کر بیرہ کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گئی ۔ تانگہ ایک نا معلوم سی جگہ رُک گیا ۔ سڑک کے ساتھ ہی ایک اندھیری سی کوٹھڑی میں مجھے لے جایا گیا ۔ دروازہ کے اندر جاتے ہی دو تین آدمیوں نے مجھے دبوچ لیا ۔ منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک چارپائی سے باندھ دیا ۔ مجھے اور بے عزت کرتے سے اسی بیرہ نے دوسرے آدمیوں کو باز رکھا اور پھر باہر سے تالا لگا کر سب چلے گئے ۔ میرا جی ڈوب رہا تھا اور میں بے ہوشی کے عالم میں نہ جانے آپ کے ڈوب جانے کے سپنے کیوں دیکھتی اور روتی رہی ۔

آدھی رات سے اُدپر اسی بیرے نے تالا کھولا۔ مجھے تانگہ پر بٹھایا اور ندی کنارے میرے منہ سے ٹھنسا ہوا کپڑا نکال کر ــــ بولا ــ "وہ ڈوبتے جا رہے ہیں تمہارے ڈیڈی"۔ چاندنی میں مجھے آپ کی پرچھائیاں نظر آگئیں میں نے پکارا ــ آپ نہیں بولے۔ میں پانی کی لہروں میں آپ سے لپٹ گئی؟

بوڑھے باورچی نے آکر ایک بند لفافہ پیش کیا۔

"ہری! کیا ہے۔

"جی ۔ یہ خط؟

"کس کا خط ہے۔

"ایک چھوکرا ڈیوڑھی میں پھینک کر بھاگ گیا ہے۔

کامنی نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔

محترم پنڈت جی!

میرے مفلس ماں باپ دو بہن بھائی چھوڑ مرے۔ میری چھوٹی بہن کا نام شیلا اور میرے بچپن کا نام شامو ہے۔ شامو اور شیلا کے بچپن اور نوجوانی کے دن پھٹے کپڑوں ــ اور کڑاکے کے فاقوں میں گذرے شیلا پڑدسیوں کے میلے کپڑے دھوتی۔ اور شامو چار آنے روز پر گندے جھکڑے صاف کیا کرتا۔ نہ جانے کیسے ! سیٹھ دھولو رام نے ترس کھا کر شامو کو اپنی بس کا کنڈکٹر بنا دیا اور دھولو رام کا لڑکا شام بس کا

ڈرائیور تھا۔

آج سے بارہ سال پہلے ــــ بس کے حادثہ کے سلسلہ میں "شام" اور "شامو" کا چالان عدالت میں پیش ہوا۔ حادثہ کی تمام ذمہ داری شام ڈرائیور پر تھی۔ غریب شامو۔ کنڈیکٹر "گیہوں کے ساتھ گھن" کی صورت میں پستا ہوا۔ ساتھ ساتھ تھا۔ واقعات صاف تھے۔ گواہوں نے "شامو کنڈیکٹر" کی بے گناہی ثابت کر دی تھی۔ پولیس شامو کو حراست سے رہا کرنے پر مجبور تھی؟

مگر ہوا اس سے اُلٹ استام ڈرائیور چھوٹ گیا۔ شامو کنڈیکٹر دو برس قید سخت کی سزا پا گیا۔

یہ سب کچھ یوں ہوا کہ جج صاحب نے ــــ ایک ہزار کے نوٹ۔ اور وسکی کی تین بوتلوں کا تحفہ قبول کر لیا تھا۔ انصاف کا پلڑا وسکی اور نوٹوں کے وزن سے لرز اُٹھا مسند انصاف سے گناہ گار بری۔ ناکردہ گناہ کو سزا نصیب ہوئی۔

وہ جج پنڈت بدن لال تھا۔ اور غریب مجرم شامو کنڈیکٹر!

کہتے ہیں دن پھرتے دیر نہیں لگتی قسمت کے لئے با محنت۔ دو سال سزا یافتہ کنڈیکٹر جیل کی کڑی مصیبت کاٹ کر رہا ہونے والا "شامو" آج ہیرا لال اے کلاس ٹھیکیدار کے نام سے لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ ہر بڑے شہر میں میری تعمیراتی ایجنسیاں ہیں۔ کوٹھی ہے۔ کار ہے اور کوٹھی میں اونچے خاندان کی تعلیم یافتہ خوبصورت بیوی اور

بچوں کی بہار رہے۔

آج سے تین مہینے پہلے آپ کے مکان کی مرمت کا ٹھیکہ میری ایجنسی کو ملا۔ آپ پہلی بار ہیرا لال ٹھیکیدار سے ملے۔ آپ کے حافظہ کے پردوں پر سے شاموکنڈ بکمڑ کے نام کی یاد مٹ چکی تھی۔ مگر شامو جج مدن لال کی صورت اور نام کو بھول سکتا تھا۔ آپ سے ملتے ہی دل میں انتقام کی بجھی ہوئی جوالا بھڑک اٹھی ——

مجھے بہت جلد آپ کی اندرونی حالت کا پتہ چل گیا۔ آپ کی عمر بھر کی جائز ناجائز کمائی شراب کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ آپ کی پنشن کے چار پانچ سو روپے کا بڑا حصہ آج بھی جام و مینا کی نظر ہو رہا تھا۔ خالی ٹھاٹھ کے کھوکھلے پن میں آپ اپنی اکلوتی اولاد کامنی کے ہاتھ پیلے کرنے سے بھی معذور تھے۔

میں نے آپ کی کمزوری کا پہلو بھانپ لیا۔ میری کار ہر شام آپ کو گرینڈ ہوٹل کے بار میں رنگین جام کی مستیوں میں ڈبونے کے لئے لے جاتی رہی آپ مستی کی ترنگ میں جج کی شان برقرار رکھنے کے لئے ہر شام کے تیس چالیس روپے کے بل پر دستخط کر دیتے رہے۔ جو میرے اشارے پر قبول کر لئے جاتے تھے۔

گذری رات میری کلائی پر آپ کی بیٹی کامنی کے دو آنسو ٹپکے ان آنسوؤں کی دو بوندوں نے میری چھوٹی بہن شیلا کی یاد دلا دی۔ جیل جاتے ہوئے میری اسی کلائی پر [illegible]

ٹپکے تھے۔ اس غریب شیلا کے آنسو۔ جو بھائی کی عدم موجودگی میں غنڈوں کی ہوس کا شکار ہوگئی۔ اور چھ مہینے کے اندر اندر ہی وہ خون کے آنسو روتی بھائی کے سہارے کی تلاش کرتے ہسپتال میں دم توڑ گئی۔

کامنی کے آنسوؤں میں شیلا کے لہو کے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے اُسی رات تین مہینے سے پنپتے منصوبے کو عملی صورت دینے کی جلدی کی۔ اور یہ صورت میرے منصوبے کے مطابق پوری اُتری۔ ندامت کے دریا میں غرق ہوتے ہوئے گنہگار کو بیٹی کی پاکیزہ محبت کنارے پر کھینچ لائی۔

۔۔ جج صاحب ۔ میں بے گناہ سزا یافتہ مجرم۔ آپ ہم پیشوں میں بے آبرو جج۔ دونوں کا پیشہ بیکار۔ مگر ہم دونوں کو جینا چاہیئے۔ ایک کو کمانے کے لئے دوسرے کو پینے کے لئے۔ کمانا اور پینا اونچی سوسائیٹی۔ اور مہذب سماج کی زندگی ہے۔ یہ زندگی گذارنے کے لئے ہم دونوں مجبور ہیں۔

کامنی۔ تمہیں دو تین گھنٹے میرے کرایہ کے غنڈوں کے ہاتھوں تکلیف اُٹھانی پڑی۔ مگر مجبوری تھی۔ تمہاری عزت اور عصمت کا نگران میں آپ تھا تم میرے دشمن کی لڑکی ہی سہی مگر میں تمہیں بیٹی کہہ چکا ہوں۔ تمہاری ذہنی اذیت کا احساس مجھے تڑپا رہا ہے امید ہے تم میری نوجوان بہن کے انجام کے پس منظر میں یہ اذیت بھول جاؤ گی ۔ یہ پانچ ہزار کا چیک مجازی باپ کا تحفہ مجازی بیٹی کے

نام کا ہے۔ اُسے قبول کرنے سے مجھے سکون حاصل ہو گا۔

جج صاحب! بے غیرتی کا شدید احساس انسان خود کشی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اور یہ آسان منزل ندی کی طوفانی لہروں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ خیال تھا کہ اِس منزل کی طرف بڑھنے کے اشارے کا نشانہ چوک جانے کے بعد ـــــ آپ کی ذہنی اذیت کا مقصد پورا نہ ہو گا۔ اِس لئے کامنی کو گھر سے اغوا کر کے اُسے ہوٹل میں آپ تک پہنچانا مقصود تھا۔ مگر ہوٹل میں بیٹے کے بجائے ندی کی لہروں میں باپ بیٹی کے ملاپ کا منظر ہولناک نہ سہی۔ میرے لئے روح فرسا ضرور تھا۔ گو اِس سے جیل کے دو دو سال تک جہنمی آگ میں جلنے والے بے گناہ مجرم کی اذیت کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک گونہ اطمینان قلب... حاصل ہو سکتا ہے۔

جج صاحب! آخر میں یہ ہو ا بھول جائیے۔ گرینڈ ہوٹل کے مینجر اور بیرے کی چیرہ دستیوں کو بھی معاف کر دیجئے۔ وہ دونوں بذات خود اچھے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے روپے کی کرامات کا تماشا تھا۔ گرینڈ ہوٹل کے بار کی بے باقی کی رسید رکھ لیجئے۔ آپ کے ذمہ بار کا اب کوئی قرض باقی نہیں۔

(آپ کا شامو عرف ہیرالال)

اِس کے بعد پھر کبھی مدن لال گرینڈ ہوٹل کے بار میں نہیں دیکھے گئے شامو کنٹریکٹر کے انتقام کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

●●

شری دینا ناتھ رفیق

خدا کی لاٹھی

مشرقی ندی کا نام "پیتا" اور جنوبی ندی کا نام "بیتار" ہے
ان دو ندیوں کے سنگم پر شہر پونچھ واقع ہے۔
"بیتار" شہر پونچھ سے تین میل دور نیلی کنٹھ پہاڑ کی برفانی جھیل سے نکل
کر پہاڑوں کے دامن میں جھاگ اڑاتی چٹانوں سے ٹکراتی اور گرجتی دھاڑتی
ہوئی شہر پونچھ کا طواف کرتی پیتا ندی سے مل جاتی ہے۔
ہم تین سیاح ہمہ تن سے اسی بے تار ندی کے منبع کی جھیل "ڈرڈار
جھامری" کا وسیع مرغزار اور تمل پیٹھ کے چٹانی برفانی اور گھنے جنگل کے
مناظر دیکھنے کے لئے جا رہے تھے۔
سانپ کی طرح بل کھاتی بے تار کے کنارے کی تنگ پگڈنڈی
پر پہلا قدم احتیاط سے اٹھانے پر ہی دوسرا قدم رکھا جا سکتا ہے۔ اس
لئے ہم تین مسافر بھی [illegible] ہر قدم دیکھ بھال کر رکھ رہے تھے۔ آگے
آگے [illegible]

کندھوں پر کھانے پینے کا سامان بستر کمبل اور برتنوں کا بوجھ لادا ہوا تھا یا غا اچھے تن توش کا پہاڑی مزدور تھا لمبا میلا سا کرتہ گھٹنوں سے اوپر "تنبا" پاجامہ اور سر پہ کندھوں سے لپٹی ہوئی کالی لوئی ـــــ اور لوئی کے منہ تک سے پر پڑھا ہوا لوجھا جسے وہ چار پانچ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈانگ نما "سوٹے" کی ٹیک دے کر کھڑے کھڑے ہی دم لے لیتا تھا۔ لالہ جی سفید پگڑی سیاہ ٹویڈ کا فراک کوٹ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوتے تھے۔ چوڑے کندھوں کے درمیان فراخ چہرہ بارعب چہرہ گرجدار آواز سے وہ ہر راہ گیر کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے ہوئے بھاری بھرکم جسم کو لاٹھی کی ٹیک سے سنبھالتے دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ میری نوخیز حالت تیرہ چودہ سال کی عمر دشوار گذار پہاڑی راستوں کی مسافت طے کرنے کے ناقابل تھی۔ مگر پہاڑی سیر کی ہوس کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔

اب دن ڈھل رہا تھا اور منزل کوسوں دور تھی۔!

ندی کے کنارے کنارے خود رو جھاڑیوں کنکروں پر چڑھائی اترائی کے تنگ موڑوں پر چلنا آسان کام نہ تھا۔ قدموں کے نیچے ندی کی اچھلتی لہروں کی جھاگ چٹانوں پتھروں سے ٹکرا کر ہمارے قدموں کو چوم رہی تھی۔ کہیں کہیں یہ پر شور لہریں دو چٹانوں کے درمیان سمٹ کر ہیبت ناک گرج کے شور سے پہاڑوں کو یوں گونجا رہی تھی جیسے نظروں سے اوجھل کہیں کہیں شدید گولہ باری ہو رہی ہو ـــــ نیلے پانی کی تہہ میں مچھلیوں کے چمکتے جھنڈ نظر آتے ہی غائب ہو جاتے تھے۔ اوپر کی طرف پہاڑوں کی برفناک چوٹیاں برف اور گھنے جنگلات سے بکھر بکھر کر حد نظر کو روک رہی تھیں۔

ان چوٹیوں پر نیلے آسمان کی جھلک یوں دکھائی دیتی تھی جیسے ان چوٹیوں
پر نیلا سا سائبان سا تنا ہوا ہو۔

ہم تینوں مسافر جنگلی پرندوں کی چہکار۔ ندی کی یک آہنگ مسلسل
گونج۔ جنگلی پھولوں کی مست خوشبوؤں میں بسے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہے تھے
سینہ میں سیر کے پر شوق جذبات لئے ہوئے اپنی گھما گھمی کی دنیا سے
دور قدرت کی پر سکون فضا میں جو سنسان بھی تھی ۔ اور پر شور بھی ۔ ہمارا قافلہ
رواں دواں تھا۔ جوں جوں ہوا لطیف ہوتی جا رہی تھی ۔ ہم پر مُردنی سی
مُسلط ہوتی جا رہی تھی ۔ اور اب تھکان ہر قدم پر غالب آ رہی تھی ۔ پچھلے موڑ
سے دو کوس کی مسلسل چڑھائی سے دم پھول چکا تھا۔ اور منزل پر پہنچنے
سے پہلے ہی درمیانی منزل پر آرام کی خواہش بڑھ رہی تھی ــــ لیکن
حدِ نظر تک نہ کہیں کوئی انسانی بستی نظر آ رہی تھی۔ نہ کوئی مکان۔ یا جھونپڑا ــــ
اب ہم دامنِ کوہ سے کمر کوہ تک آ پہنچے تھے ــــ گھنے جنگل میں سے
راستہ اور بھی تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر ہم مسلسل بڑھتے رہے۔ اب ایک
اونچی گھاٹی پر سے وسیع مرغزار کا منظر سامنے تھا۔ دیار کا گھنا جنگل طے
کرنے کے بعد نیچے ندی کی مچلتی لہریں نظر کے سامنے تھیں۔ مگر اب
اُن کا شور کانوں سے ٹکرانے کے بجائے مدھم پڑ چکا تھا۔ اور نیلے
آسمان کی چھت اب کچھ کھلی کھلی سی نظر آ رہی تھی۔

سُورج مغربی پہاڑوں کی اوٹ میں غروب ہو رہا تھا۔ ڈوبتے سورج

سورج کی ترچھی شعاعوں میں سامنے کی چوٹیوں پر بلوریں برف اسونے

کے ڈھیلے کی طرح چمک رہی تھی۔ ہم نے پہاڑ کی "دھار" چوٹی پر پہنچنا تھا۔ پھر دھاروں کے سبزہ زاروں پر سے ہوتے ہوئے سامنے ہی برف سے ڈھکی ہوئی جھیل کے کنارے کی منزل ہماری منتظر تھی۔ لیکن سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور ہمارا قافلہ آہستہ آہستہ چوٹی تک کی چڑھائی کے خطرناک راستہ پر گامزن تھا۔

تھوڑی دیر شفق کی سرخی میں ارد گرد کا منظر جیسے آگ کے شعلوں میں نہا اٹھا۔ اور پھر دیار کی اونچی چوٹیاں رات کی تاریکی میں ڈوبتی چلی گئیں۔ —— پرندوں کی بولیاں چیخوں میں بدلتے ہوئے بند ہو گئیں۔ اب جنگلی جھینگروں اور ندی کے شور کی دھیمی آواز ہم آہنگ تھی۔ سرد ہوا کے یخ بستہ جھونکوں سے ہم کانپ رہے تھے۔ دائیں طرف پہاڑی آبشار گرجتا ہوا دامن پہاڑ میں گہری غاروں میں گم ہو چکا تھا۔ تاریکی کے ساتھ ساتھ مناظر کا دلکش ماحول بھی خوفناک ہراس کے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ —— مگر۔

باغا کی رہنمائی میں ہمارا قافلہ بہت جلد چوٹی پر جا پہنچا۔ تاریکی کے پردوں میں ارد گرد کے ڈھلانوں کے نظارے مستور رہتے۔ چوٹی پر ہم تھوڑی ہی دیر سستانے پائے تھے۔ کہ باغا نے اکسایا۔

" لالہ جی! منزل تھوڑی ہی دور رہ گئی ہے۔ میرے نقش قدم پر قدم بڑھاتے چلے آئیں۔ اللہ مشکل آسان کرے گا۔

آرام دہ بوٹوں میں ہمارے پاؤں کے چھالے چرمرا رہے تھے تھکن سے پنڈلیاں اور کمر دکھ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا۔ کہ اسی سبزہ زار میں ہا ۔۔۔ پھیلا کر ہمیشہ ۔۔۔ کے لئے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ اٹھائے جا رہا تھا۔ تھری

پھر آرام کے بعد ہی جیسے ہم تازہ دم ہوئے اٹھے اور باغا کے نقش قدم
پر چل پڑے۔ تاروں بھرا نیلا آسمان سبز حاشیوں میں یوں نکھر آیا
تھا۔ جیسے زمرد کی طشت میں ہیرے چمک رہے ہوں۔ پہاڑوں کی اونچی
چوٹیوں پر نکھرے آسمان کی عظمت کتنی عظیم پر کیف ہو اٹھی ہے۔ اس
کا مشاہدہ آج تک لوح دل پر نقش ہے۔ سرد ہوا کی لہروں سے
ہم سُن سے ہو گئے۔ مگر رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ دور کی گھاٹی میں الاؤ سا
جلتا نظر آیا۔ باغا فرط مسرت سے چلا اٹھا۔

"لولا لہ جی" ہم آ پہنچے۔ الاؤ کے پاس ہمارا انتظار کیا جا رہا تھا۔
نور خاں" اونچے پہاڑوں کے مرغزاروں میں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ چرانے
والا گڈریا تھا۔ اور نور خاں کی دعوت پر ہی ہم نے پہاڑی سیر کا پروگرام مرتب
کیا تھا۔

نور خاں باغا کی مخصوص سیٹی کی آواز سن کر فوراً چوب چراغ کی مشعل
جلا کر پیش رو آیا۔ نور خاں کو دیکھتے ہی ہم سفر کی تمام کوفت دور ہو گئی۔
نور خاں کی میزبانی نے چھوٹے سے ڈھارے "جھونپڑے" کو
خوب گرم کیا۔ روشن کر رکھا تھا۔ ڈونگے پر ہوئے مارو کے پتوں کا ستھرا فرش
بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں دودھ دہی کی ٹکیاں دھری تھیں۔ ہم دشواروں
کی کٹھن مسافت کے جہنم سے گویا جنت میں پہنچ گئے تھے۔

دوسرے دن سے تار ندی کے منبع کی وسیع جھیل ڈوڈارسر دیکھی
جو اونچے پہاڑوں کے درمیان انگڑائیاں لے رہی تھی۔ گہرے اور نیلے

پانی کی سطح پر (گلیشر) یہ خاکی تودے تیر رہے تھے۔ شام کی شفق میں اس جھیل میں آگ سی جل اٹھی تھی۔ جھیل کے گرد دیار کے سربلند درختوں کے سائے جھیل میں رقص کناں تھے۔ یہ نظارہ جتنا مسحور کن تھا۔ اتنا ہی خوفناک بھی۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے جھیل کی لہریں گویا اچھل اچھل کر کناروں سے ٹکراتی تھیں۔ ایک طرف جھیل سے نکلنے والا پانی نشیب کے کوہ میں آبشار بن کر گر رہا تھا۔ اور یہی آبشار بے تاب ندی کا مخزن تھا۔ جھیل سے پرے پہاڑوں کے وسیع کف دست مرغزار میں ہری دوب کا فرش زمردیں بچھا ہوا تھا۔ جس میں منقش۔ لال پیلے۔ کاسنی رنگ کے کوسموں میں کھلے ہوئے پھولوں کے قطعے یوں لگ رہے تھے جیسے سبز قالین پر گل بوٹے ابھرے ہوں۔ نور خاں کی رہنمائی میں "تمل پتھر" کی سپاٹ خوفناک اچٹانی پہاڑ میں مارخور اور کستوروں کے نشیمن دیکھے تمل پتھر کے عقب میں برف سے لدی چوٹیوں کے نیچے دیار کے گھنے جنگلوں میں سورج مکھی اور دوسرے جنگلی پھولوں کی مست اور تیز خوشبو سے سر چکرا اٹھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم گئیں۔ لطیف ہوا کے جھونکوں میں سانس کی آمد و رفت میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے تمام بدن سنسنی سی چھا رہی ہے۔ اور جسم بے وزن ہو اٹھا ہے۔

اونچے پہاڑوں کی لطیف ہوا میں سانس لینے والے انسان عموماً سست اور آرام طلب ہوتے ہیں۔ نور خاں نے ہماری سستی کی توضیح کرتے ہوئے بتایا لیکن اس کے باوجود ہم نے تین دن اس مست اور لطیف ماحول میں گذارے سیر کی ہوس پوری ہو گئی۔

تیسرے دن سہ پہر کو ہماری واپسی کا پروگرام عمل میں آیا۔

اس مرتبہ ہمارے چھوٹے سے قافلے کی رہنمائی کا فرض "باغا" کے سپرد
تھا۔ باغا پراسرار پہاڑوں کی سرزمین کے نشیب و فراز اور ان بیابانوں
میں انسانی بستیوں کے محل وقوع سے واقف تھا۔

وہ ہمیں گھنی جھاڑیوں میں الجھنے سے بچانے کے لئے پہاڑوں کی گھاٹیوں
اور چوٹیوں پر سے "دھار" کے کھلے راستوں سے لے چلا۔ اُس نے بتایا۔

دھار (چوٹیوں) سے نیچے اترنے پر کھلی وادی میں پلان (گاؤں)
راستے میں واقع ہے شب باشی کے لئے پلان میں آرام کا ٹھکانا مل جائے گا۔
لیکن یہ پلان ہزاروں فٹ نیچے کی کھلی وادی میں کوسوں دور واقع
تھا۔

اور ہم —— دن رات چلتے رہنے سے چور چور ہو چکے تھے۔ لالہ جی
اور میرے پاؤں کے چھالے ابل آئے تھے۔ ہر قدم لنگڑاتا سا اٹھ رہا
تھا۔ نس نس میں ٹیسیں سی مچل رہی تھیں۔ لیکن چلنا ضروری تھا۔ اور یہ ضروری فرض
ہر حالت میں نبھانا تھا۔ نور خاں کی مہربانی کا شکریہ ادا کرکے ہم چل پڑے
کوسوں بھر کے سبزہ زاروں کو روندتے دھاروں کے اور گرد گھنے دیاروں
کے جنگل کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ایک دوراہے پر آن پہنچے
باغا ٹھٹھک گیا۔ دوراہے میں ایک راہ کو اپنانے میں باغا کی یادداشت
مفلوج ہو گئی۔ کسی راہ گیر سے راستہ پوچھنے کے انتظار میں بہت دیر کیا
مگر ایسے کوہساروں میں رہنے والے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ ——
آخر باغا نے "اللہ کا نام لے کر داہنے ہاتھ کی اونچی اور کھلی چوٹی کی طرف چلانے

والا راستہ اختیار کیا ـــــ لیکن یہ راستہ تھوڑی دور جاکر گھنے جنگل میں
گم ہوتا گیا۔ ہم سنبھل اور گھپ کی جھاڑیوں میں الجھتے بڑھتے گئے ـــــ نہ جانے
کتنی مسافت طے کی جنگلی درندوں سے مڈبھیڑ ہونے کے ڈر سے خائف تھے
اس لئے جلد از جلد جنگل سے باہر نکلنا چاہتے تھے۔ لیکن گم کردہ راہ کے
مصداق بھٹکتے ہوئے۔ قافلہ کو راستہ نہ ملا ـــــ بہزار خرابی ـــــ ملا
بھی تو اس وقت ملا ـــــ جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور دیاروں کی
اونچی چوٹیوں پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں ناچ رہی تھیں۔

دن ڈھل گیا۔ شام کا دھندلکا پھیلتا گیا۔ اور اس دھندلکے کے
ساتھ ہی دفعتاً آسمان پر تیرنے لگے۔ اور اس مہیب فضا کو تیرگی نے
اور بھی مہیب بنا دیا۔ ہمارا قافلہ گھاٹی سے چوٹی پر پہنچنے اور بجائے پناہ
ڈھونڈنے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن بل کھاتے تنگ سے راستے
کی دشواریاں اور اندھیرا سدِ راہ بن رہے تھے۔ گھٹا ایم کے ساتھ تیز
اور چیختی سرد ہواؤں کی لہروں میں سنسناتی سیٹیوں سے وادی گونج
رہی تھی۔ باغا "طوفانی" ہواؤں کے رُخ سے آشنا تھا ـــــ کانپتی
آواز میں بولا۔

" لالہ جی! ـــــ جلد جلد قدم بڑھایئے۔ بادلوں کا طوفان آئے ہے"
لیکن لالہ جی اور میں تھکن سے نیم مردہ ہو رہے تھے۔ ہمارا بند بند دکھ رہا تھا
پاؤں کے چھالے پھوٹ رہے تھے۔ اور طوفانی بادل برسنے سے پہلے ہی
میری کم ہمتی ہمت ہار چکی تھی۔ ایک قدم آگے بڑھانا بھی دوبھر ہو چکا تھا
میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور ایک پتھر پر بے اختیار بیٹھ گیا۔
لالہ جی ـــــ میری حالت دیکھ کر اپنی حالت بھول گئے ـــــ پچکارتے

ہوئے بولے۔

"کیوں بیٹا ہمت ہار بیٹھے۔ نوجوان گھبرایا نہیں کرتے۔ حوصلہ بلند رکھو۔ ذرا دیکھو پہاڑ کی چوٹی سامنے نظر آ رہی ہے۔ چوٹی پر رات کاٹنے کے لئے کوئی نہ کوئی ٹھکانہ مل ہی جائے گا۔ باغا نے تائید کی۔

" جی ہاں! چھوٹے بابو —— یہ تمام علاقہ ویران ہی رہتا ہے۔ برفانی طوفانوں میں کوئی انسان یا جانور یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ اس لئے اونچے پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں کے آس پاس میں انسانی بستیاں نظر نہیں آتیں۔ چوٹی پر کوئی نہ کوئی گھر ضرور ملے گا۔ لیکن میری لڑکھڑاتی ٹانگوں اور پاؤں کے چھالوں نے جیسے عدم تعاون کا اعلان کر دیا۔ لالہ جی بھی پاس بیٹھ گئے سر پر ہاتھ پھیرتے میری ٹانگیں اور پاؤں دبانے لگے۔ میری مصیبت پر اُن کی آنکھیں اُمڈ آئیں۔ کتنا پیار تھا باپ کا بیٹے سے " باغا " نے بھی ساتھ دیا۔ پاؤں دبانے سے جب مجھے تھوڑا سا سکون حاصل ہوا۔ تو ماحول کی ویرانی اور آسمان پر چھائے ہوئے کالے بادلوں سے اور وحشت بڑھی۔ اس طرح حوصلہ ہارنے سے تو اس ویرانے میں بھٹکتے ہوئے زندگی ختم ہونے کا خطرہ ہے۔ میں انسرنگی کو خیر باد کہہ کر اٹھا۔

"چلئے" لالہ جی۔ باغا سچ کہتا ہے۔ طوفان آنے سے پہلے ہمیں چوٹی پر پہنچنا لازم ہے۔ لالہ جی خوشی سے جھوم اٹھے۔

" ہاں بیٹا دھیرے دھیرے قدم بڑھاؤ۔ اب چوٹی تک تھوڑا فاصلہ رہ گیا ہے۔ پوچھو باغا اور کتنا چلنا پڑے گا"؟

بس ابھی پہنچ جاتے ہیں۔ لالہ جی! باغا نے رُک رُک کر جواب دیا

معلوم ہوتا تھا۔ باغا کے کندھے بوجھ کے دباؤ سے پسے جا رہے ہیں۔ اور کچھ محنت مزدوروں پر بوجھ اٹھاتے ہوئے بھی ہیں آگے قدم بڑھانے کے لئے اکسا رہا ہے۔ اور آپ اس بوجھ کے نیچے پستا ہوا بھی ہمارا تر و تازہ دم رہنمائی کر رہا ہے۔ کیا اس کے پاؤں میں چھالے نہیں پڑے۔ جب رہا نہ گیا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔

"باغا تمہارے پاؤں میں بھی چھالے پڑے ہیں؟"

باغا ہنس دیا۔

"آپ نازک مزاج ہیں بابو جی۔ ہمارے پاؤں برف اور کیچڑ میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔ سبز گھاس کا بچھونا خوب نرم اور گرم ہے۔"

سچ مچ اس نرم اور گرم بچھونے میں باغا کے پاؤں آگے ہی آگے قدم بڑھا رہے تھے۔

سورج چھپا یا تو اکھنا ایک سنسانی بھر دیا۔ جنگل اور پہاڑوں کی سنسان فضائیں عجیب سی کانا پھوسی کی سرسراہٹ۔ تنگ راستہ ہر قدم پر پھسلنے کا خطرہ۔ نہ جانے ہم کیونکر دیر لرزتے کانپتے ڈگمگاتے قدموں سے آخر کار چوٹی کے کھلے میدان میں جا ہی پہنچے اور دم لینے کے لئے سبزہ زار میں بیٹھ گئے۔ چاندنی طرف ہر کا عالم۔ ماحول کی ویرانی سے دہشت سی برس رہی تھی۔ طوفانی بادلوں اور سرد ہوا کے جھونکوں سے بچنے کے لئے کسی انسانی بستی کی تلاش میں نظریں گھومنے لگیں۔ عین نظر کے سامنے دور کی چوٹی پر کسی گھر سے مدھم سی روشنی کی [illegible] نے آس بندھائی۔ مغرب کی طرف سے اٹھے بادلوں میں گرج اور چمک نے خطرے کا الارم دیا۔ ہوا کی تیزی میں سنسناتی سیٹیاں [illegible]

"لالہ جی جلدی کیجئے۔ سامنے کے گھر تک پہنچ جائیں۔ تو آرام سے دم لیجئے گا۔"

اٹھئے۔ چلئے چلیں۔

"باغا سچ کہتا ہے اٹھئے۔ ابھی اس گھر میں جا رہیں گے۔"

پھر باغا کے کھینچ کہنے پر ہم تیزی سے گھر کی جانب چل پڑے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ خدا نے ہماری سن لی۔ چوٹی کے ساتھ گھاٹی میں اس اکیلے گھر کا ہونا اور نظر آنا معجزہ سے کم نہ تھا۔ چھوٹی سی گھاٹی تک کا راستہ مختصر تھا۔ اور یہ راستہ طے کرنا گھنٹوں کی نہیں منٹوں کی بات تھی۔ لیکن ہم چوٹی سے گھاٹی کی طرف گھومنے کی بجائے پچھلی سمت چل پڑے۔ اندھیرا گہرے ہوئے بادلوں کی دل ہلا دینے والی گرج سے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے یکایک بجلی کوندی اور ہمیں غلطی کا احساس ہوا۔ لالہ جی باغا کی رہنمائی پر جھلا اٹھے۔ غریب باغا جو پہلے ہی سراسیمہ تھا۔ کانپتے ہوئے بولا۔

" لالہ جی اندھیرے نے میری عقل مار دی۔ لیجئے اب ہم ٹھیک راہ پر جا رہے ہیں۔

لیکن ٹھیک راستے پر چلتے ہوئے بھی گھنگھور بادلوں نے آ گھیرا اور بوندا باندی سے موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ بجلی کے کڑکنے سے دل دہل اٹھے۔ گھپ اندھیرے میں راہ ٹٹولتے ٹھوکریں کھاتے بھیگتے اور کانپتے ہوئے گھر کی منڈیر تک جا پہنچے کوندتی بجلی کی جھلک میں ماحول کا احساس ہوا۔ یہ گھر کھیت میں خاصا لمبا چوڑا پہاڑی کوٹھا تھا۔ دروازے کے سامنے ہی چبوترے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اور اس آگ کی روشنی باہر زور سے نہ آتی تھی۔ لیکن یہ کیا۔ دروازے کے اندر ہماری پرچھائیاں پڑے

ہی کھٹ سے پٹ بند ہو گئے۔ ہم اس عجیب حرکت پر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ مینہ کی بوچھاڑ سے پناہ لینے کے لئے ہم بنڈیر کے نیچے ہی انتظار میں کھڑے رہ گئے۔ سروں پر رکھے تولیے نچڑ رہے تھے۔ اور [illegible] کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ جسم اکڑے جا رہے تھے۔ اور جاڑے کی شدت سے میرے دانت بجنے لگے تھے۔ "لالہ جی" نے بڑھ کر دروازہ پر دستک دی۔ اندر سے جواب ملا۔

"کون ہے؟"

"مسافر"

"یہ مسافر خانہ نہیں میرا گھر ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"ٹھیک ہے بھائی۔ ہم تمہارے گھر میں رات بھر کے لئے پناہ لینے آئے ہیں۔" لالہ جی لجاجت سے بولے۔

"چلے جاؤ! [illegible] نیچے [illegible] مسافر خانہ کھلا ہے۔ میرے گھر میں [illegible]" [illegible] جواب [illegible] تھا۔

"بابا آگے بڑھا۔

"بھیا۔ اندھیری رات زوروں کی بارش کھلا میدان ایسے وقت میں ہم" بابا کی بات کاٹتے ہوئے جواب ملا

"کہاں کے رہنے والے ہو۔"

"بلاں کا"

"تم تو مسافر نہیں ہو۔ باقی مسافروں کو سیدھے گھر لے جاؤ۔"

[illegible]

سے کتنی دور ہے؟

"بحث مت، چپکے سے چلے جاؤ۔" اب آواز انتہائی درشت اور نیزہ آزما تھی۔

"سنو بھائی ہم تھانہ کھوڑٹہ سے آئے ہیں۔" لالہ جی نے پینترا بدلا۔

"تو سیدھے یہاں کے چوکیدار کے گھر جاؤ —— یہاں ٹھہرنے کی کوئی جگہ وگہ نہیں ہے۔ صبح چوکیدار کے ساتھ آجانا۔"

"بھیا تم بھی انسان ہو۔ ہم بھی انسان ہیں گاؤں کا کھانی چارہ نہ سہی انسان کو تو انسان سے ہمدردی ہونی چاہئے۔ کیا تم ہماری جان جاتی دیکھ کر خوش ہو گے۔ —— باغا نے کہا۔)

"یہ وعظ یہاں کی مسجد میں جا کر کرنا۔ بھلا چاہتے ہو تو یہاں سے دفان ہو جاؤ۔"

"کم بخت، کتنا تنگ۔ دل زرشتی ہے۔ لالہ جی منہ ہی منہ میں بڑبڑائے

باغا پھر گڑگڑائے لہجہ میں بولا۔

"اے نیک انسان دور چوٹی سے تیرے گھر کی روشنی دیکھ کر آئے ہیں۔ اتنے بڑے کوٹھے کے ایک کونے میں سکڑ کر پڑے رہیں گے۔ اور طوفانی رات کٹ جائے گی۔ تو پو پھٹتے ہی اٹھ کر چلے جائیں گے۔ تیرا گھر تجھے مبارک رہے۔ رات بھر رہنے کا کرایہ چاہتے ہو۔ تو وہ بھی مل جائے گا۔

"چل دور ہو بدبخت۔ بڑا آیا ہے کرایا والا۔ چور کہیں کا بھاگ جا۔"

جواب میں انتہائی تلخی تھی۔

لالہ جی کی غیظ و طیش [illegible] جوش میں آ گئے [illegible] بڑھا ہوا سیدھا دروازے

کے پٹ پر ڈنڈے مارا۔

"یا تو دروازہ توڑ کر اندر جائیں گے۔ یہ کم بخت انسان نہیں جو ان سے بھی یہ ڈر ہے۔ ہم تین یہ اکیلا ہے۔ دیکھیں کیا کرتا ہے۔

"دروازہ توڑا تو بھری ہوئی بندوق داغ دوں گا ـــ اندر سے بھری ہوئی للکار آئی۔

"سائیں ـــ خدا سے ڈر ـــ یہ چور ڈاکو نہیں۔ بھولے بھٹکے مسافر ہیں۔ رات بھر کرنے میں پڑے رہیں گے تو ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔ اس سارے بیابان میں ہمارا ہی اکیلا گھر ہے جسے دور سے دیکھ کر آئے ہیں۔ دروازہ کھول دے۔ ٹھٹھرتے مسافر آگ سینک لیں بیچارے۔

"یہ لوچدار آواز گھر کی بیگم کی تھی۔ مینہ کی بوچھاڑ میں ٹھٹھرتے ہم کان لگا کر میاں بیوی کی باتیں سننے لگے۔ شاید ہماری سشملبری کی راہ نکل آئے۔ اور اس جنگلی وحشی کا دل پسیج جائے۔

"کیا تو ان کو جانتی ہے۔ سائیں میاں نے بیوی سے پوچھا۔

"اتنا جانتی ہوں یہ ہمارے جیسے انسان ہیں۔"

"چور ڈاکو نہیں۔"

"بیگم ہنس پڑی۔ ہمارے کھٹل جھاڑنے کے لیے دور سے چور ڈاکو نہیں آئیں گے۔

اس جواب سے جیسے میاں سائیں جل بھن اٹھا۔

"ٹر ٹر مت کر ـــ بکتی پڑی رہ ـــ

"سائیں میں کہتی ہوں کہ اللہ کے قہر سے ڈر ـــ

"میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور نہ بندوں سے ـــ ڈرتا ہوتا تو اس

چوٹی پر گھر بن جاتا۔ یہ گھر میرا ہے۔ تجھے اس معاملے میں بولنے کا حق نہیں ہے

"تو یہ اچھی۔ سائیں بابا گھر کی باتیں چھوڑ دیجئے۔ کیا تو اتنا بے رحم ہے تیرے دل میں خوف خدا نہیں۔"

"بس چپ رہ ـــ حرام زادی ـــ میں تیرے مکر جانتا ہوں۔ بڈھی ہمارے رہ آئے مسافروں کی بجائے یہ اس کے رشتہ دار ہیں۔"

"مسافر خدا کے بھیجے ہوئے مہمان رشتہ داروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں ـــ باہر بارش گرج چمک اور طوفان ہے۔ خدا کو دیکھ میں کہتی ہوں ـــ دروازہ ـــ کھول کر ـــ نہیں ـــ

"چپ رہتی ہے یا نہیں ـــ

سائیں خدا کے لئے خدمت کر ـــ دروازہ کھول دے۔ تو نہیں کھولتا تو میں کھولتی ہوں۔"

"چپکی بیٹھی رہ سور کی بچی ـــ

"میں سور کی بچی اور تم۔ میرے خاوند ہو کر کیا ہوئے سور۔"

چٹاخ کی آواز ابھری اور ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ بھی۔ کم بخت سائیں کا ہاتھ رحم دل بیوی پر اٹھ چکا تھا۔ ہم یہ ظلم زیادہ دیر تک سننا برداشت نہ کر سکے۔

یاغا یول اٹھا چلو لالہ جی! لالہ جی آہ بھر کر بولے ظالم بخت تیرا خانہ تباہ ہو۔ لے الپاق۔ بجلی چمکی اور ساتھ ہی خوفناک گرج بھی ـــ بارش کا زور بڑھ چکا تھا۔ موٹی موٹی بوندیں یوں پڑ رہی تھیں جیسے اولے برس رہے ہوں ـــ

ایسے میں جائیں تو جائیں کہاں

یاغا بول اٹھا۔

"آئیے لالہ جی ــــ کوٹھے کے منڈھیر کی آڑ سے نکل کر ہم تینوں کوٹھے کے ارد گرد کے مکی کے کھیت میں گھس گئے۔ آگے آگے یاغا دونوں مکی کے ڈانڈ ہٹا کر راستہ بناتا چل پڑا۔ مکی کی فصل سے بھرپور کھیت کیاری پر کیاری زینے کی سی شکل میں واقع تھا۔ آخری کیاری کے سرے پر چار تپلے سے اونچے کھمبوں پر مچان چھپر جیسا تنا تھا۔ اس اونچے مچان پر رات بھر بیٹھے بیٹھے جنگلی جانوروں سے کھیت بچانے کا کام لیا جاتا تھا۔ ہم تینوں گرتے پڑتے اس مچان میں جا بیٹھے۔ مچان میں کچھ سوکھی لکڑیاں پڑی مل گئیں۔ یاغا کی ہمت نے آگ روشن کر دی اور آگ کی تپش نے ٹھٹھرے مردوں میں جان ڈال دی۔

مکی کے پودوں میں گھرا ہوا۔ ڈانگ دو طرح سے کھلا اور دو طرح سے گھاس پھوس میں ڈھکا ہوا تھا۔ لکڑی کے فرش پر مٹی کی تہہ بچھی تھی۔ اس پر ملائم گھاس کا ستھرا فرش تھا۔ ڈانگ [illegible] کر بارش اور اولوں کی تیز بوچھاڑ سے تو بچا رہا۔ مگر گھاس پھوس کی نیچی چھت کہیں کہیں سے ٹپک رہی تھی آگ کی گرمی سے ہاتھ پاؤں میں سکت آتے ہی بھیگے کپڑے اتار کر ادھر ادھر ٹانگ دیے۔ اور بستر کے نمدار کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ طوفانی مصیبت سے ایک گونہ سکون پاتے ہی پیٹ میں دوڑنے والے چوہوں کا خیال آیا۔ لالہ جی نے ساتھ میں پکے ہوئے مکی کے ڈنڈے، اور رکھاڑی (پیشرال) کا سالن گرم کیا۔ اور بغیر پانی کے ہی [illegible]

ہوتے ہی ڈونگہ میں سمٹ کر لمبی تان لینے کی ٹھہرائی۔ موسلا دھار مینہ کا زور تھم چکا تھا۔ اور بادلوں کی گھمن دھمک میں بجلی گرج کے ساتھ رہ رہ کر چمک اٹھتی تھی۔ میں کمبل اوڑھ لے کر کمرے میں پڑ گیا۔ مگر آنکھوں میں نیند کہاں۔ لالہ جی اور باغا انگاروں کے گرد بیٹھے ہوئے نمدار کمبل سکھا رہے تھے۔ لالہ جی باغا سے کہہ رہے تھے۔

" باغا اس دنیا میں ایسے سنگدل اور بد اخلاق لوگ بھی ہوتے ہیں اس کا تجربہ نہ تھا۔ آج پہلی بار ہوا ہے۔

" پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ لالہ جی۔ نور خاں سے اس سائیں یا نہ جانے کیا نام ہے۔ اس کا مقابلہ کیجئے۔ اس نے ہماری آسایش کا کتنا خیال رکھا۔ — پھر آتی بار بچا رہے سے جو میسر ہو سکا۔ آپ کے سامنے دھرا — کلاڑیاں۔ شیرمال، تیرا، گچھیاں۔ بنفشہ۔ مکھن۔ مصلون۔ جنگلی چیائے۔ شہد۔ خدا کی قسم یوچھ سے کندھے دکھ رہے ہیں۔ نور خاں تو آپ کا گہرا دوست ہوگا۔ لالہ جی۔

دوست کے لفظ پر لالہ جی ہنس پڑے۔"

" ارے نہیں۔ باغا ہماری دوستی، دوستی کوئی نہیں شناسائی ہے ایک آدھ بار کچہری میں کچھ کام کرا دیا تھا۔ غریب کا اس احسان کا بدلہ چکانے کے لئے اس نے پہاڑوں کی سیر کی دعوت دی اور ہم چلے آئے۔

" اللہ اللہ کتنا نیک انسان ہے مجھے کہتا تھا۔ باغا بھائی جتنا مکھن دہی کھا سکتے ہو۔ خوب کھاؤ۔ اللہ کا فضل ہے گھر میں دودھ گھی کی کمی نہیں۔

" نیک نیت ہے نا بھائی۔ اب اس سائیں کو ہی دیکھو۔ ایسے انسان کتنے ... گڑ کے ... اپنے ... چا ... [illegible]

پر ہاتھ اٹھاتے۔ مسافروں کو دم بھر بھی گھر میں ٹکنے نہ دے خدا کی لاٹھی اگر ہے۔ تو شاہ ایسے ظالم پر ضرور پڑے گی۔

"سچ ہے لالہ جی! آپ بھی اس کے خانہ تباہ کی بد دعا دے کر چلے آئے ہیں۔

"بد دعاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ انسان کے اپنے اعمال ہی شامت اعمال بن جاتے ہیں۔ باغا یاد رکھو نیتوں کے ہی بیڑے پار ہوتے ہیں۔ لالہ جی نے پورے وثوق سے کہا۔ باغا خشخشی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔

"لالہ جی۔ ہم ڈھور ڈنگر چرانے والے پہاڑی لوگ انتہائی سادہ مہمان نواز اور کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ آپ تو اللہ کے فضل سے امیر اور شہری اور پڑھے لکھے نازک طبع لوگ ہیں۔ ہم غریب ہیں اور غریبوں کے پاس کیا ہوتا ہے۔ بات کرنے کی تمیز کہاں ہوتی ہے۔ پھر بھی مہمان نوازی سنت رسول سمجھ کر پورے خلوص بھی کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے رہیں گے۔ مہمان کو تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ یہ سائیں بھی ہم ہی لوگوں میں سے ہے۔ پر اللہ جانے اس کا دماغ ٹھکانے نہیں۔ یا ماگجی شہید کے پیر کی بے ادبی کا اثر ہے ۔۔۔۔ میں نے بھی اپنے لوگوں میں آج ہی ایسے ظالم انسان کو دیکھا ہے۔ جو قہر الٰہی سے بھی نہیں ڈرتا۔

آدھی رات ہو چلی تھی۔ لالہ جی اور باغا ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے لیٹے ہی تھے۔ کہ پہاڑوں کی پراسرار چوٹیوں میں سے عجیب

ہوتے ایک چوٹی سے دوسری چوٹی سی گونجنے لگی۔ ایک کرخت اور یک آہنگ صدا۔ جیسے کوئی کسی کو " ناڈ " کی سی آواز میں پکار رہا ہے یہ صدا بلند ہوتے ہی باغا دو زانو ہو کر آہی تو یہ کا ورد کرنے لگ پڑا۔ لالہ جی اندر سے ایک عجیب سی دہشت زدگی کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گئے باغا کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ڈھلکنے لگے۔ صدا بتدریج بلند ہوتے ہوتے صدائے بازگشت بن گئی۔ ــــــ اور پھر مدہم ہوتے غائب ہو گئی۔ ــــــ لالہ جی چپ چاپ اکڑوں بیٹھے تھے میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے باغا سے پوچھا۔

" باغا سچ بتانا یہ آواز کیسی تھی ؟ "

" کچھ نہیں بابو جی ــــــ دور پہاڑوں میں کہیں بادل گرجا ہو گا۔ باغا نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے رک رک کر جواب دیا۔ مگر میری تسلی نہ ہوئی۔

" جھوٹ کہہ رہے ہو باغا۔ یہ بادلوں کی گرج کی آواز نہیں تھی میں نے دیکھا نہیں سنا ہے۔ بابو جی اونچی چوٹیوں کے گھنے جنگلوں میں " بن باڈھی " رہتی ہے۔ جب یہ بن باڈھی کسی گھر کے انسان کو پکارتی ہے۔ تو اس گھر کی تباہی آجاتی ہے۔ ــــــ بن باڈھی کی کہانی میرے لئے نئی تھی کسی گھر کی تباہی سے بن باڈھی کا کیا تعلق ہے۔ پھر یہ بن باڈھی کیا چیز ہوتی ہے۔ میں اسی قسم کے سوالات کے جوابات چاہتا تھا۔ مگر لالہ جی نے اشارہ سے روک دیا۔ نہ جانے کیوں ؟

مطابق یہ سائیں کے گھر سے آ رہی تھی۔ سائیں کا گھر نشیب میں ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ ہم نسوانی چیخ پکار رونے کی آواز ہی سن سکے دیکھ نہ سکے۔ روتے میں کسی بچی کی آواز بھی شامل تھی۔ پھر اسی سائیں کی گرجدار آواز ابھری۔

"جا — دفع ہو جا مال زادی۔ اب گھر میں گھسنے نہ دوں گا۔

" معلوم ہوتا ہے اسی کم بخت شیطان زادے نے بیوی سے جھگڑتے اور بچی کو پڑتے مینہ میں گھر سے باہر نکال دیا ہے۔

باغا نے چیخ پکار کی وضاحت کی۔

" اب اس کی تباہی یقینی ہے۔" لالہ جی نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دیر ہو کا عالم طاری رہا۔ گرج اور چمک کا زور بڑھ گیا۔ مینہ کی بوچھاڑ اور بھی تیز ہو گئی۔ چیخ پکار کی آوازیں گم ہو گئیں۔

دفعتاً ہمارے ڈنگے کے آس پاس "غرانے" اور مکی کے اونچے پودوں کو مسلنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔

ہم اور بھی خوف زدہ ہو گئے — باغا نے ایک جلتی لکڑی کی روشنی میں ڈنگے سے باہر جھانکا — اور پھر سرگوشی سے بولا۔

" دوہائی ہے لالہ جی : کھیت میں ریچھ اور اس کے بچے گھس آئے ہیں — وہ مکی کا ناس مار رہے ہیں۔

" اب کیا ہو گا — لالہ جی گھبرا اٹھے۔ کہیں یہ جانور اس مچان پر بھی دھاوا نہ بول دیں"

" نہیں لالہ جی بے فکر رہیے۔ — یہ ڈنگے پر نہیں آ سکتے۔ آپ کہیں تو ان کو بھگانے کے لیے ہانک لگا دوں۔

ان کو جیسا پھر سے دو بھاگی ... یہ طرف سائیں کی ... ہا

کی نسبت اللہ ہے۔ اسے ہم نہیں ٹال سکتے۔ —— | لالہ جی نے جواب دیا
اور سچ مچ —— ہم خدا کی طرف سے اس تباہی کو کیسے ٹال سکتے تھے
جو ابھی سائیں پر نازل ہونے والی تھی۔ پو پھٹتے ہی لالہ جی کی پیشن گوئی پوری
ہو گئی۔

اولے اور موسلا دھار بارش کا زور تھا۔ ہم مچان پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ کہ دفعتاً زور سے بادل گرجا۔ بجلی کڑکی اور آسمان سے ایک شعلہ سا زمین کی طرف اترا۔ گرج اور چمک سے پہاڑوں کی بنیادیں ہل گئیں۔ ایک ایٹم بم کے دھماکے کے شور سے دشت و جبل تھرا اٹھے۔ ہمارا مچان جھکولے لینے لگا۔ اور بجلی کی چمک سے موندی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔

"خدا کی لاٹھی" بجلی کی لاٹھی کی صورت میں سائیں کے گھر پر گری تھی۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ نشیب سے دھواں اور آگ کی چنگاریاں سی آنکھوں کے سامنے ناچ اٹھیں۔

"خدایا پناہ —— باغا چیخ اٹھا —— بجلی گری ہے لالہ جی!"

"خدا کی لاٹھی برس گئی ہے باغا"

"ٹھیک ہے لالہ جی! یہ بجلی سائیں کے مکان پر ہی گری ہے۔ آگ کی چنگاریاں اور شعلے —— مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ پناہ گاہ سے نیچے اترنا موت کے مترادف تھا۔ پھر کڑکتی بجلی، برستے مینہ اور اندھیرے کھیت میں سے جنگلی جانوروں کے جھنڈ میں سے ہوتے ہوئے سائیں کے مکان تک پہنچنا ایک امر ناممکن تھا۔

تھکن کچھ یا چند گھنٹوں کے ناخوش گوار واقعات کے ظہور کا اثر سے مجھ پر بخار اور سرسامی کیفیت طاری ہو گئی۔

لالہ جی میری حالت دیکھ کر اندر بھی گھبرا اٹھے سر اور پاؤں دابنے لگے اور پیار سے دعائیں دینے لگے۔ باغا ساتھ تھے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد آنکھیں موندنے لگیں۔

صبح آنکھ کھلی تو صبح سے ڈھلتا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لالہ جی اور باغا بیٹھے ہوئے میرا سر داب رہے تھے۔ مجھے ہلکا سا پسینہ آ رہا تھا۔ اسی حالت میں اُٹھ بیٹھا۔ غمگین لالہ جی خوش ہو گئے۔

"کیا حالت ہے طبیعت کی بیٹا"؟

"اچھا ہوں لالہ جی چلیے یہاں سے چلیے"

"ٹھیک ہے چلنا چاہیئے باغا"

کچھ دیر میں بستر لپیٹ کر باغا کی رہنمائی میں ہم چل پڑے۔

مکی کے کھیت میں تباہی کے آثار نمودار تھے۔ —— نہ کوئی پودا تھا۔ نہ دودی بھٹے تمام فصل روندی جا چکی تھی۔ ہم کھیت کے منڈیروں سے گذرتے سائیں کے مکان کے پچھواڑے جا پہنچے۔

"انشد اللہ سائیں کا کوٹھا کہاں ہے لالہ جی۔ باغا چلا اٹھا۔

کچھ دیر...

کا کوٹھا کہاں تھا۔ سامنے جلا ہوا کھنڈر تھا جس میں کوٹھے کی مٹی سے دبی ہوئی
سلگتی لکڑیوں میں سے ابھی بھی دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ تمام کوٹھا مٹی کے
ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا اور اس ڈھیر تلے دو تین آدمی سائیں کی لاش
ڈھونڈ رہے تھے۔

کھنڈر کی شکستہ دیوار پر ایک نوجوان خوبصورت دیہاتی عورت بیٹھی تھی
جیسے سفید پتھر کا بت دھرا ہو۔ تین چار سال کی لڑکی عورت کے کندھوں پر
سے حیرت سے منہ کھولے گھر کے کھنڈر کی طرف گھور رہی تھی۔ عورت دونوں
ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ عورت
کے پاس ہی ایک بھاری جسم دراز قد سفید پوش بوڑھا کھڑا تھا جو لاٹھی کے اشارے
سے کھنڈر میں ملبہ ہٹانے والے چار پانچ ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

لالہ جی بوڑھے کے پاس کھڑے ہو گئے۔

"مقدم کہاں سے آئے ہو؟" ـــ بوڑھا متوجہ ہو گیا۔

"جی! ریشی کے گاؤں سے!" بوڑھے نے جواب دیا "ہمارا ڈیرہ
اوپر "جھاری" کی ڈھوک میں رہتا ہے۔ ہم گاؤں سے آٹا نمک وغیرہ
لے کر ڈھوک جا رہے تھے۔ کہ راہ میں یہ تماشا دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔" پھر
ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"مقدر پورا ہوا ـــ بدبخت سائیں محمد کی موت اسی طرح لکھی ہوئی
تھی۔۔!"

"اس سائیں محمد کو جانتے ہو بابا؟" لالہ جی نے پوچھا

"بوڑھا مسکرایا

ہمارے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ نام [illegible] رکھا تھا۔

ندی کنارے جو جاتا ہو ر نظر آتا اُسے ندی کی لہروں میں جھکیل کر خوش ہوتا۔ اس نے گاؤں بھر کو دشمن سمجھ رکھا تھا۔ پھر یہاں چلا آیا اس اونچی گھاٹی میں سامنے کا دس کھیت توڑ کیا۔ اتنا لمبا چوڑا کوٹھا۔ اپنی ہی ہاتھ ہمت سے تعمیر کیا۔ اور ـــــ اور ـــــ بوڑھا آگے کہتا کہتا رک گیا۔

لالہ جی نے لقمہ دیا۔

"ہاں تو اور کیا کیا۔"

بوڑھا ہونٹ دبا کر راز دارانہ انداز سے بولا

"کم بخت نے مانجھی شہید کی زیارت کا پاس ادب بھی نہیں کیا۔ زیارت کے پتھر اکھیڑ کر یہ کوٹھا کھڑا کیا۔ مانجھی شہید کا قہر سر میں سما گیا۔ کسی کو کوٹھے کے نزدیک بھی پھٹکنے نہ دیتا تھا۔ سنتے ہیں رات بھر اس کوٹھے میں بھونچال سا رہتا تھا۔ اور کوٹھے کی چھت اکڑتی رہتی تھی۔ آخر ظلم کی حد پوری ہو گئی۔ تقدیر کا لکھا پیش آگیا۔

"بابا ہم تین مسافروں نے طوفان اور گرجتے بادلوں میں رات بھر کے لئے پناہ مانگی۔ منتیں کیں۔ واسطے دیئے۔ مگر سائیں محمد نے دروازے کے پٹ نہ کھولنے تھے نہ کھولے۔ اس کی بیوی نے سفارش کی۔ تو اُسے پیٹا اور شاید گھر سے بھی نکال دیا۔

"یہ بچی اور عورت میریاں سائیں محمد کی ہی ہے۔ بوڑھے نے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پہلی بار ڈبڈبائی آنکھوں سے عورت نے ہماری طرف دیکھا۔ لالہ جی

شفقت آمیز لہجہ میں بولے۔

"ہاں بیٹی" آدھی رات میں تمہاری چیخیں اور رونے کی آوازیں ہم نے مچان پر سُنی تھیں۔ مگر کیا کرتے جنگلی جانوروں کے ڈر سے تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ افسوس ہے کہ تمہارے مالک بچارے سائیں محمد کی موت ہو گئی...

... چپ چاپ بیٹھی عورت بجلی کی طرح تڑپ اٹھی

"اس کم بخت کا نام نہ لیجیے میاں جی وہ وحشی میرا خاوند نہیں۔ دشمن تھا۔ آخر خدا نے میری فریاد سن لی۔ اس کے ظلم سے نجات دلوائی۔"

"میریاں! خدا جانے پچھلے چھ سات سال تم نے اس کے ساتھ کیسے گزارے؟"

بوڑھا مسکراتے ہوئے میریاں سے بولا۔

"موت کے ڈر سے"، میریاں نے مختصر اور تلخ جواب دیا۔

کھنڈر میں ملبہ ہٹاتے اور نیم سوختہ لکڑیوں کے نیچے سے جن کی آگ بارش اور کیچڑ میں بجھ چکی تھی۔ سائیں محمد کو تلاش کرنے والے چلا اٹھے

میاں جی! سائیں محمد کا تابوت مل گیا ہے۔ اُسے کیسے باہر نکالیں

میاں جی: آپ ہی کھنڈر میں کود پڑے ہم سب جانے لگے۔

ملبے کا ڈھیر ہٹاتے چلے تو ایک چھت کے ایک ادھ جلی لوٹی میں سائیں محمد کا ڈراؤنا چہرہ، کھلی آنکھیں۔ اور اکڑا ہوا بازو آسمان کی طرف یوں اٹھا ہوا تھا۔ جیسے وہ کسی پر گھونسہ تاننے کو تیار ہو۔ آگ ہریا چھلے اور کیچڑ میں لتھڑے۔ انسان کا ہیبناک ڈھانچہ پہلی بار دیکھ کر میراں رحکیہ اُٹھا۔ آگے کی طرف لڑھک جانے کو تھا۔ لاکھ جی نے تھام کر گھاس کے فرش پر لٹا دیا۔ خدا جانے یہ حالت کب تک رہی جب حالت

ذرا سدھری تو دیکھا۔ سائیں محمد کا ڈھانچہ کھنڈر کے پچھواڑے ایک کھائی میں دفنا کر قبر میں ہی ڈالی جا رہی ہے۔ چند نٹیوں کی نکالی ہوئی مٹی کے ڈھیر سے قبر تیار ہو گئی۔

میاں جی یاغا اور ساتھیوں کے ہاتھ فاتحہ خوانی کے لئے اُٹھ گئے میں اور میر یار فاتحہ خوانی کی رسم حیرت سے دور بیٹھے دیکھتے رہے۔ فاتحہ خوانی ختم ہوتے ہی مشتاق پانی کے چشمے پر ہاتھ منہ دھونے کے لئے۔ میاں جی اور اُن کے ساتھی بوجھا سنبھالنے لگے۔

لالہ جی نمناک پلکوں کو رومال سے پونچھتے میاں جی سے بولے
" میاں جی سمجھ نہیں آتا۔ کہ بجلی کہاں سے گری اور آگ کیسے لگی۔
میاں جی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولے۔
" لالہ جی کوٹھے کے " اوگن " (دودکش) سے بجلی کی لائٹ اندر آئی۔ سائیں محمد کو ختم کرتے نہ دیکھے۔
دروازے کے پٹ چیر کر باہر نکل گئی۔
" لیکن آگ اور چھت کا گرنا
میاں جی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رُک رُک کر بولے۔
" اللہ کی قدرت ـــــ چولہے میں آگ جل رہی تھی تار دھماکہ کی لہر سے آگ بکھر کر چھت کو جا لگی ہو گی۔ بجلی چھت کا تو گرنا ہی تھا۔ پھر بارش کے پانی اور چھت کی مٹی سے آگ بھی دب گئی۔
خب انہی سے ڈریئے لالہ جی ـــ دیکھئے اللہ کے قہر نے ایک پل میں سائیں کو بھی ختم کر دیا۔ کوٹھا بھی نابود ہو گیا۔ اور اسی پل میں تمام کھیت کی فصل بھی تباہ ہو گئی۔ ہوئی ہو کر رہتی ہے۔ ٹلتی نہیں لالہ جی۔

ٹھیک ہے بھائی ۔ مگر تعجب ہے تو یہ ہے ـــــ لالہ جی ۔ میریاں کی طرف دیکھ کر کہتے کہتے رک گئے ۔ اب میریاں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی ۔

" میریاں کیوں رو رہی ہے " صبر کر بیٹی " ـــــ میاں جی تشفی آمیز لہجے میں کہنے لگے ۔ مرنے والا مر گیا ۔ اچھا تھا یا برا تیرا خاوند تھا ۔ اللہ بیچارے کو جنت . . . . . .

" وہ جنت میں جائے یا جہنم میں ـــــ میریاں تڑپ اٹھی مجھے اس سے کیا غرض ـــ جس کم بخت نے مجھے آدھی رات کو (سسکیاں لے کر) لاٹھی سے پیٹ پیٹ کر دروازے سے باہر دھکے دے کر نکالا ۔ اس روتی بلکتی بچی پر بھی رحم نہ کیا ۔ سامنے گھاس کے گٹھے ڈھیر میں بچی کو گود میں لیے ، رات بھر بھیگتی رہی اور ٹھٹھرتی بیٹھی رہی ۔ کیا اللہ ایسے ظالم پر رحم کرے گا "

سچ ہے میریاں ! اللہ ایسے ظالم پر رحم نہیں کرتا ـــــ مگر میاں جی چہرے پر ہاتھ پھیرتے خلا میں گھورتے ہوئے بولے ۔

ہم نہیں جانتے ۔ اللہ کو شاید فقط ظالم کو ہی سزا دینا مقصود تھا ـــــ مگر آہ ہی سے اس کے پتھر دل پر مہر لگ گئی ۔ اس نے خدا کی برسنے والی لاٹھی سے بچنے اور مسافروں کو بچانے اور دور رکھنے کے لیے گھر کے دروازے بند کر لیے ـــــ یہ ہوتی تھی میریاں اس لیے اللہ کا شکر کرو ۔ تم سب کے سب کیسے معجزے کی بدولت بچ گئے ۔

با عنایت شکر ہے اللہ کا کہہ کر چپ ہو گیا ۔ مگر میریاں برابر روئے جا رہی تھی ۔

لالہ جی نے پوچھا۔

میریاں ——— رونے سے کیا ہوگا۔ ہمارے ساتھ چلو۔ تمہیں تمہارے میکے پہنچا دیا جائے گا۔

"کیا لے کر جاؤں لالہ جی: میریاں نے ہچکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ اسی لئے تو رو رہی ہوں کہ اس ظالم کی موت کے ساتھ میرے چند کپڑے، چاندی کے کچھ گہنے بھی سب جل گئے ہیں۔

میریاں ——— سائیں محمد کو نہیں اپنے چند گہنے اور کپڑوں کی پوٹلی کو رو رہی تھی۔

لالہ جی نے میریاں کی آس بندھائی۔ میاں جی نے پوری مدد کا وعدہ کیا۔ میریاں ہمارے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی۔ چلتے چلتے لالہ جی نے میاں جی سے پوچھا۔

"میاں جی: واقعہ کی رپورٹ کہوٹہ کے تھانہ میں پہنچائی ہوگی۔

"میاں جی سر دھنتے ہوئے بولے"!

"ہاں لالہ جی آپ غریب گاؤں والے کبھی خواہ مخواہ پس جائیں گے جو ہونا تھا ہو گیا۔ یہ گھاٹی پہلے بھی ویران تھی۔ اب بھی ویران ہی رہے گی۔ اللہ پاک دھرتی پر ظالموں کے وجود کو گوارا نہیں کرتا۔ میاں جی اور ان کے ساتھی ڈہوک کی طرف چل پڑے اور ہم نچلے گاؤں کی طرف۔ چلتے چلتے۔

یاغا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ——— لالہ جی آپ کی بددعا پوری اتری۔ گھڑی بھر میں ہمارے دیکھتے دیکھتے ——— لاٹھی مار سائیں کا خانہ برباد ہو گیا۔

لالہ جی ——— چلتے چلتے رک کر بولے ——— باغا سنتے آئے

ہیں۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ مگر آج آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا کہ

خدا کی لاٹھی با آواز بھی ہوتی ہے۔
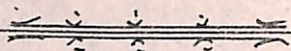
نوٹ:- یہ افسانہ نہیں۔ واقعہ ہے جسے میں نے قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کامیاب ہے یا ناکامیاب۔ اس کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں آپ کا کام ہے۔

رفیق

شری موتی لعل کپُور

برف باری

پچھلے پانچ برس سے ہمارے ہاں " دینا" جلانے کی لکڑیوں کا گٹھا پہنچا رہا تھا۔

دھوپ ہو یا بارش گرمی ہو یا سردی بلکہ برف باری میں بھی ہر دوسرے دن " دینا" کے کندھوں پر گیلی سوکھی لکڑیوں کے گھٹے کا پہنچنا ضروری تھا۔ اور یہ "ضرورت" دینا "کی ضرورت مند ہستی بغیر ناغہ کے وقت مقررہ پر برابر پورا کرتی چلی آ رہی تھی۔

دینا کا پورا نام دین محمد تھا۔ دین محمد کے نام کا احساس انگوٹھا لگاتے وقت اکثر شدت سے ہوتا تھا جب دین محمد کے بجائے دینا" لکھ دینے والے کو مان لینا پڑتا تھا۔ کہ دین محمد ولد مقام نورالدین قوم گوجر ذات سانگو پر حق ہے اور سانگو نسل کے کسی فرار زدہ یا ناڑی چیچاں کا ہونا ایک تاریخی واقعہ ہے۔

ہاں تو دین محمد پورے آٹھ کوس چل کر نوبتا کے آخری سرے
کے جنگل سے لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے ہمارے آنگن کے منڈیر پر گٹھا رکھ
کر سر سے ٹوپی کی چھب اکھیڑتا پیشانی سے پسینے کے قطرے انگلی سے
پونچھتا ہوا برآمدے میں داخل ہوتا۔ اور ٹوپی کا منڈاسا نیچے رکھ کر دیوار
کے سہارے گھٹنے جوڑ کر بیٹھ جاتا۔ بائیں ہاتھ سے ایک مشت دو انگل
بھدری داڑھی سے کھجلاتا پھر سر سے میلا سا رومال ہٹا کر استرے سے منڈے
ہوئے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پکار اٹھتا " سلام ہے بابو جی "؛

اکہرے بدن کا ادھیڑ عمر دین محمد ایک باصحت اور تنومند انسان
تھا۔ اس کی ہتری داڑھی بچہ بزے کے مشابہ تھی۔ کتابی چہرہ، چندھیائی
سی آنکھیں، ستواں ناک اور کانوں تک پھیلے ہوئے موٹے ہونٹ
غرض دلچسپ صورت و شکل کا ایک ہیولا تھا۔ جو کسی کباڑیئے سے خریدی ہوئی
بھوری میلی بوشرٹ، پہنے ہوتا جس کے نچلے دو بٹن بند اور باقی چاک
گریباں میں سے چھاتی کے سرسراتے بال نمایاں تھے۔ کبھی موٹے کھدر کی
گھٹنوں سے اوپر کی میلی سی شلوار اور اس شلوار سے کالی اون کا لٹکتا آزار
بند ـــــ بھوری اور کالی سی اون کی بنی ہوئی پرانی ٹوپی۔ یہ ٹوپی بیٹھتے وقت
کندھوں سے اتر کر مخملی صوفہ بن جاتی۔ اور اٹھتے ہوئے جھاڑ جھاڑ کر پھر
کندھوں اور سر پر آکر دستار فضیلت بن جاتی۔ یہ ٹوپی ہی دین محمد کے کارزار
حیات کی رفیق سفر تھی۔ اوڑھنے بچھونے کے علاوہ بارہ مہینے ہی دریدہ
اور یہ کمبل ٹوپی دین محمد کو آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کی بھی ڈھال
تھی

پول بیٹھے ہی دین محمد کے اونٹ کے جیسے پاؤں سے بڑی احتیاط سے عُدا ہوتی اندر روئی کی تہہ میں چھپا دی جاتی ۔ اس لیے نہیں کہ "پول" کو نظر بد لگنے کا اندیشہ تھا ۔ بلکہ اس لیے کہ اکثر نظر چوکتے ہی بچوں کے ہلکے نٹ ، بال کی پھیر بیچارے دین محمد کی پول ہی بن جایا کرتی تھی ۔

مجھے دین محمد کی آمد کا انتظار رہتا ۔ جوں ہی اس کی آواز کانوں میں ہچکیا رس گھولتی میں کمرے سے باہر آجاتا ۔ میرے ہاتھوں میں اخبار دیکھ کر دین محمد کی ستھاس بھری سے پول اٹھتی ۔

" بابوجی! بیبا بھی سناؤ کیہہ خبر ہے (مجھے بھی نئی خبر سنا دو ۔)

میں مسکراتے ہوئے اسے نئی خبر سناتا ۔ کہ اب آواز سے بھی تیز رفتار جہاز ہمارے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے بم برساتے گزرا کریں گے ۔

وہ حیرت سے منہ کھول دیتا ۔

" سبحان اللہ " ہن دنیا مکن پر آگئی ۔ (ختم ہونے پر آگئی ہے ۔) اے بابوجی! سوچتا کتنی حقیقت ہے ۔ دین محمد کے لفظ "مکن" میں ۔ کیا ہماری دنیائے سائینس کی گرمی کے عروج کا اختتام اب " مکن " کے درجہ انجماد تک نہیں آپہنچا ہے ۔

مجھے دین محمد کی گجری باتوں میں نہ جانے کیوں گہرا انقیاتی فلسفہ جھلکتا معلوم ہوتا ۔ دین محمد نہ فلسفی تھا نہ رموز دان فطرت ۔ سیدھا سادھا معصوم سیرت دیہاتی تھا ۔ مگر باتوں ہی باتوں میں زندگی کی کتنی محسوس حقیقتیں کہہ جاتا تھا ۔ اس کے ذہن میں مہذب سوسائیٹی کی بلند پایہ زندگی کی پرچھائیوں تک اس کا گزر نہ تھا ۔ [illegible] کبھی فلم دیکھا [illegible]

میں گھومتا تھا۔ تمام زندگی میں ایک بار جب وہ بیس یا بائیس برس کا نوجوان تھا، قصبے سے بھاگ کر نہ جانے کیسے راولپنڈی پہنچ گیا تھا۔ قصبے سے راولپنڈی کا درمیانی فاصلہ ڈیڑھ سو میل ہے یہ فاصلہ ان دنوں پورے سات روز میں طے ہوتا تھا۔ راولپنڈی جیسے بڑے شہر میں پہنچ کر دین محمد یوں پریشان ہوا۔ جیسے تیرتی کشتی میں "گرھا" بھکن والی" دنیا کے تصور سے پریشان ہو اٹھتا ہے۔ ـــ آخر دین محمد کو ہٹی کے تیل بیچنے والے ملنگ شاہ" کے دست شفقت کی "پو" کا سہارا ملا۔ اور اس "پو" کی شفقت میں دین محمد سماتا چلا گیا۔ جب "پو" دین محمد اور دین محمد "پو" میں اچھی طرح سما چکا تو دین محمد ہٹی کے تیل کے تجارتی رموز میں "راک فیلر" کے کان کاٹنے میں بھی ہوشیار ہو گیا تھا۔ اب ملنگ شاہ کے دست شفقت کی وسعت کشادہ ہو گئی تھی۔ دکان کے تھڑے پر ہی ہٹی کے تیل میں سوئے ہوئے تخت پوش پر دین محمد کے بستر لگانے کی گنجایش نکل آئی تھی۔ اور بقول دین محمد ملنگ شاہ خدا نخواستہ فرشتہ رحمت تھے۔

"کیہہ دسوں باوُجی ـــ ملنگ شاہ اپنے بال بچاں نالوں وی ودھ میرا دھیان رکھدے سن۔ نویں "لیر دکپڑے) بھی بنوا دیندے تے نویں لیف بھی ـــ ماشاء اللہ، بڑے بڑے پھلاں والی چھینٹ کی لیف، بند نہ کیتے اتاں ہیر ندہ ہے۔ کدی کدائیں چار آنے ناسوار واسطے بخشش وی دیندے سن ـــ (کیا بتاؤں باؤجی ملنگ شاہ بال بچوں سے بھی زیادہ میرا دھیان رکھتا تھا۔ نئے کپڑے اور لحاف بھی بنوا دیتا رہا۔ بڑے بڑے پھولوں والی چھینٹ کی لیف اتنی خوبصورت تھی کہ انسان دیکھتا ہی رہے۔ کبھی کبھی چار آنے

نسوار کے لیے بھی دیتا تھا)

چار آنے کی بخشش چھینٹ کی نئی لیفا کورے لٹھے کے نئے کپڑے
اتنی عظیم نوازشوں کی یاد آج بھی دین محمد کی آنکھوں کو چشم نم بنا دیتی تھی۔ دین محمد
کتنا ہی تیل والے سکندر شاہ کے پاس رہا۔ اس کا حساب بھول چکا تھا۔ ہاں
سکندر شاہ کے تھڑے سے گھر لوٹتے وقت اس کی کمر سے بندھے ہوئے
دس بالیاں، گھری چاندی کے دو سو روپے تھے۔ ایک من پختہ نمک کی
ڈلی کے ساتھ بیاہ کے چھپرے (کپڑے) چاندی کی ہنسلیاں چھلے اور گوکھرو
بھی تھے اور نئی چھینٹ کی لیفا بھی

گھر پہنچتے ہی دین محمد کی شادی خانہ آبادی کا عظیم حادثہ بہ عجلت تمام وقوع
پذیر ہوا اور دین محمد سکندر شاہ کی مہربانی کی بدولت "مہر کی گدی پر ہر مال
چلے" پاکر گویا مٹی کے تیل کے تالاب سے نکھر کر آب زر کوثر کے کنارے آن لگا تھا
یہ سفر دین محمد کی طویل زندگی کا پہلا اور آخری عظیم کارنامہ تھا جو کہ راولپنڈی کے
تیل والے سکندر شاہ کی دریافت کے بعد قصبہ کے چشمے کا مینڈک بن جانے
پر ختم ہو گیا تھا۔ مگر تیل والے سکندر شاہ کے دست کرم کی یاد اور مٹی کے تیل
کی بو کی پہچان کے معاملے میں دین محمد کا ذہن تر و تازہ تھا۔ وہ جب کبھی
موقعہ ملے مٹی کے تیل والے "سکندر شاہ" اور راولپنڈی کی داستان دلی
اظہار تشکر کے ساتھ دہرایا کرتا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ دین محمد کی جیتی "مہری" (بیوی) ایک گدڑیا (لڑکا)
چھوڑ کر اللہ میاں کو پیاری ہو گئی۔ یہ گدڑیا بقول دین محمد بڑا ذہین تھا۔
اس گدڑیے نے دین محمد کے مال جنجال کو سنبھالنے سے انکار کرتے
[illegible]

پاس کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا۔ گدریٹا فیض محمد سچ مچ ہوشیار نکلا
پرائمری پاس کر کے قصبہ کے مڈل سکول میں داخل ہو گیا۔ ادھر بے چارا
دین محمد کھیتی باڑی مال جنجال کے چکر میں ایسا پھنس کر رہ گیا۔ ہمسایہ میں ہی
سائیں کٹاریہ کی جوان بیوہ رہتی تھی۔ دونوں میں نکاح ثانی کی ٹھہر گئی
اور یہ رسم پورے چین جمعہ کے دن بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ دس آنے
فیس نکاح۔ سوا روپیہ ٹلاں جی۔ چودہ آنے کے چھوہارے اور نو آنے
کے مکھانے (شیرینی) بٹ گئے۔ پرانے ڈم ٹلا سے ہی کام چل گیا۔ اور
دعوت ولیمہ میں مکی کی روٹیاں اور ہاجی میں آئے ہوئے پانڈ کھیڑی کس
دہی پر اکتفا ہو گیا۔ تمام برادری دعوت کھا کر خوش ہو گئی۔

مگر دین محمد کے لیے نکاح ثانی کی برکت وبال جان ثابت ہوئی
یکے بعد دیگرے بقول دین محمد . . . . . .
" دو پُتر تے دو گدریاں ۔ آں اک کرچھیٹاں " رب بھلا کرے
تہاڈا۔ دسو بھلا کیہہ کرے کوئی ۔ حرام جے رج کے ٹکر وی کھان نال
ملے۔ پائی لیراں کی وی نیں پے تی "
(دو لڑکے اور دو لڑکیاں ایک گود میں خدا بھلا کرے آپ
کا۔ آپ ہی بتایئے کوئی کیا کرے۔ پیٹ بھر روٹی بھی
ملتی اور تن ڈھانپنے کو چیتھڑے بھی نہیں)
اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ چار پانچ بچوں کی فوج سالوں میں آ پہنچی ہی
گئی۔ کھیت وہی پانچ کنال تین مرلے جس میں سے پہلے دس بارہ من مکی
نکل ہی آتی تھی مگر اب خدا جانے کھیت سے برکت اڑ گئی یا دین محمد

کی قسمت ہی پلٹ گئی۔ وہی زمین آج آٹھ من مکی کی پیداوار سے آگے نہیں بڑھی۔
دین محمد کے کوٹھے (گھر) سے ملحق ہیں کہ کچھ درخت کاٹ کر کڑی
محنت سے تین چار کنال زمین "نو توڑ" کی تھی۔ وہ کم بخت ابھی جنگل اور
مال والوں نے بحق سرکار ضبط کر کے مقدمہ چلا دیا۔ بقول دین محمد۔

" جیجی ٹیے گئی بابوجی! ایک جائے دوجا آئے۔ حرام ہے گھر مال،
کمبخت اندھا کانوں دی چھوڑ لیو۔ جنگل والا لکھ۔ مال والا لکھ بھکو بھکھ لٹیں۔ جیت
کے چار پیسہ نئیں۔ یہ جابر پہلے مال نئیں چھوڑتا۔ اوہ لٹھ مقدمہ بھی کر دیتو
تحریک تمہ بگستانی پے گئیں۔ "

اور یہ مقدمہ بھی دین محمد کی جانِ ناتواں سے خون چوسنے والی جونک
بن گیا۔ آٹھ من مکی اور سال کے بارہ مہینے تو آرام سے گذر جاتے تھے۔
پھر ڈیڑھ سیر روپے کی مکی خریدنے کی باری آتی۔ جب یہ مکی بھی کھلی مارکیٹ
میں ملنا مشکل ہو جاتی۔ تو خوجہ کی کھیاجی کی نوبت آجاتی۔ خوجہ کی کھیاجی کا
معاملہ وہ کٹھن منزل تھی جسے پالینا آسان کام نہ تھا۔ ایک من والے
کے بدل ڈیڑھ من دالے "اسو کتک ماں" پہنچانے کے ساتھ
دودھ مکھن لکڑی کا تحفہ اور بڑی منت چونے سے بھی کام لینا پڑتا
تھا۔ دین محمد کی سب سے بڑی تمنا اپنا راجی کی رحمت عام سے تھی۔ اس
کا کہنا تھا۔ یہاں ایک ایک خصم ہوتے تھے۔ اب جتنوں کھنوں ہو اٹھے وہ
ہمارے پیر راج کرتے پے جاتے۔ نیشنل کانفرنس، پنچایتی ممبر، بلاک والے
یہ سب ہی خودغرض اور حکومت کا رعب جمانے والے کھڑپنچ ہیں۔
دین محمد جیسے بے بس ان پڑھ لوگوں کی فریاد کی شنوائی کہیں نہیں ہوتی
تھی۔ حلقہ کے ممبر اسمبلی کے بارے میں بقول دین محمد:-

"کیوں دسوں بابو جی ٹانگری کے کھوجانے کے بعد نے انگوں پگڑا کے پھاہ (پھانسی) لا دتو — جیہڑے کو نہ پینیڈے مار کے منڈی کے بجر ار مال جیسے کے بوٹ گھلیئے — حرام جے اُت ماں کیہے نے روٹی پانی کا دی تو پچھیے — اور پھر کوس کی منزل مار کر ووٹ نہ دیئے والے دین محمد کو آج کا ممبر اسمبلی پہچانتا بھی نہ تھا۔

دین محمد کے قیمتی اثاثۃ البیت میں دو مصلے تین پیڑھ، دو ڈنگے۔ ایک شکستہ چوبی صندوق۔ چار کنالیاں دو سابور کے مٹکیلے اور اناج رکھنے کے دو مٹی کے کوٹھلے تھے۔ مگر ان سب چیزوں میں قیمتی اور قابل عبرت دین محمد کی بھوری بھینس تھی۔ بھوری کے سینگ گنٹھیالے اور آنکھوں کے ڈھیلے نیلے ضرور تھے۔ باقی سب کچھ دوسری بھینسوں جیسا تھا۔ مگر دین محمد کا یقین ہی نہیں دعوی تھا۔ کہ بھوری کا جوڑ گاؤں میں ہی کیا۔ علاقہ بھر میں بھی کہیں نہیں ہے۔ دین محمد کے موروثی کوٹھے کی طرح بھوری بھی موروثی نسل کی بھینس تھی۔ جو پانچ پشتوں کے بعد بھی دین محمد کے پیچھے پیچھے مینگنے چلتی۔ دین محمد کی آواز پر فرلانگوں دوڑ لگاتی۔ مانو بھوری اور دینا ایک ہی روپ کے دو سروپ تھے۔

بھوری کے علاوہ دین محمد کے مال جنجال میں ایک گائے، ایک بکری تین بھیڑیں، ایک کتیا اور بلیوں کی جوڑی تھی۔ مگر دین محمد کو جتنا لگاؤ بھوری سے تھا۔ دوسرے جانوروں سے نہ تھا۔ اوروں کو فقط لون اور سوکھی گھاس پر ٹرخا دیتا تھا۔ مگر بھوری کے منہ میں کبھی کبھی گڑ کی

ڈلی بھی پہنچ ہی جایا کرتی تھی حالاں کہ "کھانگرڈ بھینس" کے مقابلے پر "مانکی"
خالص دودھ دیتی تھی۔ اور بیچاری مریل بکری تو گھر کے پوت کا پالن ہار
تھی۔

"دین محمد" کے بڑے کوٹھے میں ہر دوسرے دن کی صبح میں "مدانی
کے" اڑکن کی سُہانی آواز ابھرتی تھی۔ اور اس سُہانی آواز کے ابھار میں
چھپا ہوا پھیر پھن ابھرتا تھا۔ وہ مجنوں شاہ کی دھن رکھیا کا مال تھا۔ کھٹی میٹھی
چھاچھ کے دو پیالے، وہ بھی پکی مکی کی روٹیاں۔ تھوڑا سا پیا ہوا نمک
دین محمد کی ازلی قسمت کا تحفہ تھا جسے پاکر وہ روح اور پیٹ کی پیاس بجھا
کر لمبی تان کر سو جاتا تھا۔ بدقسمتی سے ایک ہی دن دین محمد کی بھوری بھینس
اور "مہری" دونوں بیمار ہو گئیں۔ دین محمد نے کالی اور میلی سی خالی بوتل
سی گردن سے بندھی ہوئی رسی کو پاؤں سے الگ کرتے ہوئے جب
یہ خبر سنائی تو میں سکھا۔ یہ اسپتال کے انچارج ڈاکٹر رامپال کے
پاس لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب توجہ سے بیمار کی کیفیت سننی
چاہی تو دین محمد کی آنکھوں آنکھوں اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے
بھوری اور مہری کی گدھ بیماری کی توجہ کا مسئلہ یو این او میں پاکستان
ہندوستان کا مسئلہ کشمیر بن گیا۔ آدھ گھنٹے کی مغز پچی کے بعد ڈاکٹر
صاحب آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ بھوری کو "ٹاکہ" (انمونیا) اور مہری
کو ٹائیفس نے دبا رکھا ہے۔ دین محمد بوتل میں "الی" (پہلے) بھوری
کی دوا لینا چاہتا تھا۔ جب اسے بتایا گیا کہ بھوری کی دوا ڈنگر اسپتال
کے ڈاکٹر دیں گے۔ تو دین محمد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔
" اُت کون جائے جی۔ اسے گھر میں فائدہ ہو تو ——

مایوسی کے عالم میں بادلِ ناخواستہ ——— دین محمد کی میلی بوتل چھین کر مکسچر سے بھری گئی۔ کچھ گولیاں اور پڑیاں بھی دی گئیں۔ اور تاکید کی گئی۔ کہ وہ کل صبح آکر بیمار کی کیفیت سے آگاہ کرے۔ ——— لیکن متواتر تین دن دین محمد کی آمد کا انتظار رہا۔ ڈاکٹر صاحب بار بار پوچھتے۔

"ارے بھئی کپور صاحب وہ تمہارا ارسطو نہیں آیا۔ میں مسکرا کر جواب دیتا۔

"آپ کی مسیحائی کام کر گئی ہوگی۔"

"نہیں نہیں بھائی اس کے گھر چلتے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب فکرمندانہ انداز سے کہتے مگر دین محمد کے گھر جانے سے پہلے ہی دین محمد ہمارے گھر آگیا۔ آج وہ خوش تھا۔

"بچ گئی اسے بابوجی؟"

"شکر ہے بھائی۔ ڈاکٹر صاحب بہت فکرمند تھے۔ ہم تمہارے گھر چلنے کو تیار تھے۔ دوا لینے کیوں نہیں آئے۔"

"کیت آتا بابوجی ——— بنگالی تھنہ کے پیراں کول اسے دن لے گیو تھو ——— وا دوا ڈول دیتی تھی۔ چھوری واسطے بوتل ماں ہندا کا تیل لے گیو تھو ——— پیراں نے کرامات دسی۔ اکے تعویذ گھول کے چھوری نا پلا یو۔ اُس کی کھنی (کانپنا) بند ہو گئی ——— پیراں کی نیاج کا دو روپیہ دینا اِن تیرے پلے میں ماں تھا۔ ہن نجر کا لیلہ (دیکھر کا بچہ) دی دینو آیو ہوں"

"اے بس تمہاری بھینس چھوری کا بھی تمہاری گھڑوالی مہوری کا دودھ رہا ہوں

"واہیئی مسلے' پُد کھر ر گڑدے گدرا پیا جاجوت" (حاذق) کو دل کا ڑھا واڑھا لے دا آندیں۔ آپ ہی اٹھ کھلونہ گی۔

عجیب بات ہے۔ دین محمد بھینس ہے یا ارنا بھینا" میں اسی حیرت میں ڈوب رہا تھا۔ کہ دین محمد نے مجھے چونکا دیا۔

"بابو جی —— میری بچ گئی تے ٹکراں کی چٹی —— مرگئی تے چالی پنجاہ روپے ادھار کفن کی چٹی بھوری ناں کُچھ ہو جاتو۔ —— تے دسوں کھاں۔ بُہر کت پلّتو —— پھیر حسین شاہ کو قرضو بھی تھوڑ نہ جو بھوری ہی مکانے —— نوں دیاہ۔ سو دو سو ناں ہو جاوے —— ہُن اج چھ سوال ناں دی بنیئں ملتی —— دو ہون کتّوں چھ سو لے آتو —

جب یہ بات میں نے ڈاکٹر رام بال کو بتائی۔ کہ دین محمد کی نئی شادی کا صرفہ سو دو سو روپیہ اور اس کی بھینس کی قیمت چھ سو روپے ہے۔ تو وہ بے اختیار ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

"مان گیا گھوڑ صاحب" آپ کے دین محمد اور ارسطو کے درمیان اب چھ انچ کا ہی فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔

اب تم ہی بتاؤ۔ بیگم" بڑی کہ بھینس ؟

میں نے ہنس کر جواب دیا —— بھینس

بھوری کی چٹی (مصیبت) دین محمد کی ٹل گئی۔ اور قرضہ چکانے والی بھینس بھوری دونوں ہی بچ گئیں —— ایک حاذق کے کاڑھے سے دوسری جنگالی تھنہ کے پیر کے تعویذ کی معجز نمائی سے دین محمد کو "لیلہ" (بھینس کا بچہ) اور دو لشپے نیاز کی مصیبت نے مدتوں پریشان رکھا۔

گرمیوں اور برسات کے موسم میں مجھے ہی نہیں گھر کے بچوں کو بھی

اکثر دین محمد کی یاد ستایا کرتی تھی۔ کیوں کہ دین محمد کی لونی کی بکل سے پاؤڈریا" ماں ــــــ سے اُن ہی دونوں اخروٹ ــــــ دو کھ دنڈتے ــــــ جنگلی آڑو ــــــ عام ناشپاتیاں نکل آتیں۔ اور کبھی کبھی گچھ۔ سمبھلو" محبت کے ذائقہ سے بھی ہم سب ہی لطف اندوز ہوتے۔ بچے فقط دین محمد کی جنگلی سوغات پر ہی اکتفا نہ کرتے ہوئے دین محمد کو خوش پاکر گیت سنانے پر بھی مجبور کرتے ــــــ دین محمد کی بے تال بے سنگم آواز بھینسے کے ڈکرانے جیسی ہی کیوں نہ ہو ــــــ آواز میں سوز ضرور تھا۔ دو کانوں پر ہاتھ رکھ کر سیپاہیا اور شمس راجولی سناتا ــــــ مگر بچے "رچھنی" سننے کے تمنائی رہتے۔ دین محمد کے ناں ہٹول پر دین محمد کی "پول" چھتاؤنی کے نیچے سے نہ جانے کیسے تھرکھ کرتے بال کا گنبد بن جاتی اور یہ گنبد اکثر دین محمد کے سر پر بھی اچھل کر لڑھکنے لگتی۔ اس معیت سے بچنے کے لئے دین محمد کو کبھی تاؤ سے بچوں کو رچھنی سنا کر رجھانا پڑتا ــــــ ایک دو بار میں نے بھی "رچھنی" کا گیت سُنا۔ بول کچھ اس قسم کے تھے۔

"بھلا ہے ــــــ رچھنی اے ــــــ تیرے دندیے دیاں کلیاں ـ جھنگ جھلی تے زلفاں پلیاں۔ بھلا ہے رچھنی اے"

چنبلی کے پھولوں جیسے سفید دانتوں والی رچھنی کی کی زلفیں ہوا کی لہروں میں لہراتی ہیں ــــــ لہرانے کا لفظ ادا کرتے ہوئے دین محمد کا منڈا سا پھر بھی بے اختیار لہرا اٹھا۔ اسی لہرانے کی موج سے بچے خوش ہو کر تالیاں پیٹنے لگے۔ دین محمد اسے گانے کی داد پاکر آسودہ ہو جاتا تھا۔

ایک دن دین محمد نے بہت سے جنگلی آڑو بچوں میں بانٹے پھر سے سامنے بیٹھ کر دو پیش کرتے ہوئے بولا

"یہ جنگلی میوہ تم بھی چکھو نا بابو جی ——" : اُن چھوٹے چھوٹے آڑوؤں کی رنگت کتنی خوشنما تھی۔ سنہری چمکدار سبز اور سرخی مائل رنگ گویا یہ آڑو قوس قزح کی پیداوار تھے —— میں نے جونہی ایک چکھا کھٹا کسیلا سا ذائقہ پاکر پھینک دیا۔ —— دین محمد ہنسا

"بابو جی : آج کل کا ہمارا حاکم اور یہ آڑو ایک ہی جات کا ہیں—— یا نہیں باہر دل سوہنا تے میٹھا اور اندروں کوڑا ——

کتنے پتے کی بات کہی دین محمد گوجر نے —— "ٹائی اور کوٹ" کے خوشنما لباس میں چمکتے جام یا مکھن کے پیڑے جیسے گول مٹول چہرے —— جنگلی آڑوؤں کی دلکش رنگت سے بھی چمکتا رنگ و روپ —— مگر ہمارے مہذب سماج کی جمہوریت کے ذائقہ کا عکس لطیف لفظوں میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ باہر سے جنگلی آڑوؤں کا رنگ و روپ —— اندر سے کھٹے اور کسیلے

ہر دوسرے اتوار کی صبح میں جب دین محمد ہمارے ہاں آتا تو کچھ بدلے بدلے ٹھاٹھ میں ہوتا۔ اس کی بوشرٹ، کچھ صاف سی نظر آتی۔ ازار بھی دھلا ہوتا۔ داڑھی بھی کچھ سنواری ہوتی۔ سر کی سفید چادر بھی چکنی سی لگتی۔ سب سے زیادہ توجہ طلب دین محمد کی آنکھوں میں کاجل کا ابھار ہوتا تھا۔ سیاہ سرمے کی لکیریں داڑھی اور ابرو میں تال میل کا کام دے رہی ہوتیں اس نکھرے رنگ و روپ کی جھلک میں بقول دین محمد دیدار کی عظمت کا راز پنہاں ہوتا۔ اور وہ کہتا

"اَج بیرے دار سے ناں بابو جی —— ہم گجر لوک بیرے دار نال منا اَج تے منہ نہیں تھی دھوندے تھی ستھرا رکھاں خواجہ خضر (پانی) کی نیاز چاڑ

کے کہاں پیاں ۔

میں سوچتا ہوں دیوداریتی گورزیدار" کی حقیقی عظمت کے راز سے دین محمد یقیناً بے خبر ہے۔ لیکن تعجب ہے ہزاروں برسوں سے دین محمد کی اصل نسل "برج بھاشا" بولتی اور برج باسیوں کے مقررہ دن تیوہار کے یادگاری نشان کو بدلے رنگ و روپ میں ہی سہی آج تک قائم رکھے چلی آرہی ہے۔ پھر جب میں نے اسے بتایا کہ وہ اور اس کی قوم سب "برج باسی" ہیں۔ یعنی

"بھگوان کرشن کے گوال بالوں کی اصل اور نسل سے جو کئی ہزار برسوں سے آج تک چندر بنسی خاندان کی کھشتری ذاتوں و گوتوں میں بٹی ہوئی وندھیاچل کی دنیا کی خارج ہے۔ اور اپنی موروثی روایات کو نبھائے چلی جارہی ہے۔ تو وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"سبحان اللہ۔ سچ نے یا جھیا سچ۔ ہم تم پھر ایک ہی ہوا نا۔ دھرتی ایک اللہ پیغمبر ایک۔ ہمارو تمھارو آپ ذات ایک جو اک تال کھوکھر ہوگیا تے کیتھ ہو یو ــ دیسو۔ یا دنیا پڑ کیہ جھگڑے پڑ گئے ہیں اے"

جب ملک کے بٹوارے ہندوستان اور پاکستان کے وجود اور سنہ ۱۹۴۷ء کے سفاکانہ دور کا ذکر چھڑتا تو ــ اس پر دین محمد جیسے جھنجھلا اٹھا۔

"بے ایمانان نے ہندو مسلمان ناں رکھ کے دھرتی کی خلق مان فساد پڑوا دیو ــ یو ہندوستان یو پاکستان کیہ ہو یو ــ ناں ہم ناں ایتیوں ہلنڈ ناں تم نے کیسے جانو؟ کیہ دیسوں جس دن (سنہ ۴۷ء) ذات غرق ہے گئی۔ تبرے بے ایمان خنزیر گڑاں گڑاں نے گھر گھر گھیر یا حرام ہے گھرماں کچھو بھی چھوڑو ہو جاتو مار گر ناں آگ دے ہی لاتو ۔ اللہ واسطے

گگل گردیو۔ — بڑے خونریز کت کا سامان ہوا!

پھر سنہ ۱۹۴۷ء میں اپنی پُر درد سرگزشت دہراتے اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ پاکستانی "لیڈروں" کے ہاتھوں لوٹ کے بعد بھوری مہری اور بچوں کو لے کر بیچارا مدتوں جنگلوں میں چھپتا پھرا — بیلوں کی جوڑی بھیڑ بکری لوئی ہنڈ دانہ پھکا غرض کہ پشتہا پشت کی "اجتماعی دولت" کم بخت پورے ٹنگ ڈاٹی لٹیروں کی نذر ہو گئی۔ آخر میں ٹھنڈی آہ بھر کر صابرانہ انداز میں کہتا

"اللہ کو شکر ہے یا یہ جی جان بچ گئی۔ صبر کا تھکے قبر ای ہوئے اور پھر لیے لگتا جیسے یہ صابر انسان خلا میں گھورتا کسی پرانے قبرستان میں صبر کے بعد وقت یہ بیٹھا ہوا داور محشر سے انصاف کا طلبگار ہو رہا ہو

ہاں تو بیردار کے دن ہی وہ اپنی دریدہ بوشرٹ کے چاک دکھا کر مسکین نگاہوں سے تاکتا ہوا مجسم سوالیہ نشان بن جاتا تھا۔

"بے بے جی بیردار آج اگھاڑ واہی چلے آئے ہوں۔ حرام ہے گھر ماں آٹا کی لپ دی کیدے دے سے — گدر ونو دیکھو ہاڑو لائے کھیتے — ماسٹر کا نیچ گھٹ دو بیاں دنیا ایں اج سے کچ ہو جاتو۔

اور پھر بے بے جی کے ہاتھوں نئی پرانی قمیص میں بھیڑے سے چاول اور دس دس کے نوٹ اس کی ہتھیلی پر ٹکتے ہی کاجل کی لکیریں اور بھی پھیل جاتیں بسنوری داڑھی کے کھردرے بال لہرا اٹھتے اور سکڑا ہوئے ہونٹ کانوں تک کھنچ جاتے۔ اس وقت دین محمد کی روح کی پرچھائیاں دین محمد کے چہرے پر ناچ اٹھتیں۔ اس دین محمد کے روح پاک کی پرچھائیاں جس [illegible]

حدود اربعہ سے بھی نا آشنا تھا۔ مگر ہم سب آدم کے بیٹے ہیں کے
ازلی اور ابدی نکتہ نظر پر اُس کے دین و ایمان کی بنیادیں استوار تھیں۔
نہ مسلمان ہو جانے کی ہوس سے بے جا کا شاکی تھا۔ مگر ہندو مکند شاہ تیل
والے کا رہین احسان۔ اب وہ مرنے سے پہلے دروڑ بازار والے
چنوں شاہ کا قرضہ چکا کر مرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ قرضہ اُس کے جیتے جی چکنے
کی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ فی الحال مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے
کب اس نے چنوں شاہ سے دو بیاں (چالیس روپے) قرض لیے
تھے۔ تب سے آج تک ___ دودھ مکھن لکڑیوں کے علاوہ کتنے ہی بیاں
ادا کرنے کے بعد بھی چنوں شاہ کے چھ بیاں روپے بنام دین محمد باقی نکلتے
تھے ___ جس کی ادائیگی کی فکر میں دین محمد دن رات گھلے جا رہا تھا
میں نے کئی بار ___ چنوں شاہ اور دین محمد کی حساب فہمی یا حساب فہمائی
کی کوشش کی مگر یہ سعی سعی لا حاصل ہی ثابت ہوئی ___ دین محمد کا ایمان
تھا۔ چنوں شاہ کی کاپی ہی پر کبھی جھوٹ نہیں لکھا جا سکتا۔ کیوں کہ بہی پر
جھوٹ نہیں لکھا جا سکتا۔ اس لیے چنوں شاہ کی قلم نے جو لکھا وہ
سب سچ ہے ___ اور سچ کا قرض ہر حالت میں چکانا ہی ایمان کی
سلامتی ہے ___ اُس کا کہنا تھا۔

"بابو جی۔ ہم کیوں بے ایمان بنیں ___ اللہ بے ایمان کی قبر پر
آگ برسائے ___ اللہ قیامت کو کسی کا قرض کبھار نہ چکانے
" قیامت کے بوجھ" سے ڈرنے والے دین محمد کی سادہ لوحی سے
ناجائز فائدہ اٹھانے والے چنوں شاہ کی اندھی لوٹ پر ایک دن چنوں

سے لوٹتے عاجزی سے بولا۔

"بابو جی - چنن شاہ نا کچھ نہ کہیے۔ بندہ نیک اے ہیر زماں دیلے کہ ملیے دنا ای کم آتے سیانا کہیں شاہ بنا پت نہیں ـــ میری ساکھ اُسے کول بنی ہوئی اے۔ بندہ کی ساکھ بنا ہو تو کچھ نہیں ہو تو ـــ

میں سوچنے لگا دین محمد کی بات کتنے پتے کی بات ہے۔ واقعی دین-محمد کی ساکھ چنن شاہ کے ہاں ہی تو ہے۔ اور چنن شاہ کی ساکھ سرکار دربار میں۔ دین محمد کی بوڑھے کے گھر نہیں تھوڑا ساگرد ـــ شہرہ ـــ لوگ اور چھوٹا تک اُبھر چاتے بندھی ہوئی ہے۔ شاہ دین محمد کی خدمت میں چنن شاہ نذر کا تحفہ۔ جسے قبول فرما کر شاہ دین محمد اپنے خون کا آخری قطرہ تک چنن شاہ پر نچھاور کرنے کے لئے بیتاب تھا۔

پھر ایک دن ـــ دین محمد اور اس کا نوجوان گبرو فیض محمد چنن شاہ کی دوکان سے اُٹھ کر آئے تھے۔ اور چنن شاہ نے باپ بیٹے کی ننگی کھوپڑیوں کو سفید ململ کے دستاروں سے ڈھک دیا تھا۔ اور ڈھکی ہوئی چاندی کے رعب میں دین محمد کا ہر قدم "شاپاہیا جی" کے انداز میں اُٹھ رہا تھا۔

"تم نال مبارک ہوئے۔ بابو جی؟

دین محمد کے میلے دانت کالی داڑھی کے گھٹاروں میں چمک اٹھے

"بے بے جی ـــ سلام۔ تم ناں نوی بہت بہت مبارک کھارو گبرو "فیض محمد" پاس ہو گیا اے۔"

دین محمد کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ منصبہ کا جنگل جھوم رہا تھا۔ اور دین محمد کے سوکھے لکڑی کے "گٹھے" میں ترناری کے پھول کھل اٹھے تھے۔

فیض محمد کی محنت بار آور ہوئی ۔ دین محمد کی قسمت جاگ اٹھی ۔ اور چینوں شاہ کے قرضہ کی بیل آگے بڑھی ۔ اور بیل آگے بڑھنے کی خوشی میں چینوں شاہ نے دین محمد کی گنجی چاند کو نئی دستار سے ڈھانپا تھا ۔ سکھاتوں (شیرینی) سے منہ میٹھا کرایا تھا ۔ اور مُہر ہی کے لئے " پڑنوں چھپر و " چاندریں ناسوار کی پٹڑیا اور پچھہ ہار سے فیض محمد کے سپرد کئے تھے ۔

چینوں شاہ کی سخاوت کی بارش میں بہتا ہوا دین محمد شکران نعمت کی لہروں سے جھوم رہا تھا ۔

" بابوجی ۔ چینوں شاہ کہتے ہیں کہ گدرا نال بیاہ کراؤ ۔ جو لگے ہوں آپ خرچ کروں گو "

میں ہنس پڑا

" بابوجی ہنسیں کیوں ۔ تم مت آپ جانیں اج کیڑو جبالوں آن لگہ اے ۔ نکال نکال ناں ای ہٹنگاں مال در سے جاوے ۔

" پھر جلدی کرنا بھائی ——— گدرا ڈل پاس ہو گیا ہے ۔ کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کر لو ۔ —— پھر جلدی ہی پوتے والے دادا بن جاؤ گے اور چینوں شاہ دوسری نئی بچھڑی تمہارے سر بندھائے گا ۔

میری طنز پر دین محمد کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ۔ فیض محمد کی نگاہیں جھک گئیں ۔

میں نے دیکھا کہ فیض محمد باپ کی دھندلائی پرچھائیوں کا رنگ نکھر تا چلا گیا تھا ۔ جیسے دین محمد کے کاٹے ہوئے درخت کے سوکھے کونڈے سے قوس قزح کی شاخ ابھر آئی ہو ۔ میلا سا کھیتا خاکی پاجامہ ۔ پٹہ کا پرانا انگرکھا ۔ اور نیکر ... پھٹے بانڈوں ... غربت ... مفلسی کی ... تصویر

"پانڈے جی تم سچ کہتے ہیں۔ اگلا ناں ای کچھ نہیں جھڑتو اگوں کا کے کھائیگا۔

پھر دینا محمد ہاتھ جوڑتے بولا۔

"پانڈے جی! فیض محمد کا ایک چھوٹا سا بیاہ ہو جاویں گا۔ ہم تو پاس ہو گئے لے۔ تمہارے پیران کے صدقے اس نا کے "روجی ماں لواد یو تمھاری گل چلے۔ اللہ نے تمہارا ناں پڑو کیتہ ہو نا اے۔ ــــــ آخر بقول دین محمد پیری بات اور بڑے نام نے فیض محمد کا کام بنا دیا۔

مڈل پاس فیض محمد ساٹھ روپے ماہوار کے عظیم مشاہرہ پر ماسٹر صاحب بن گیا۔

چھ مہینے بیت گئے۔ ان چھ مہینوں میں قریباً پچاس روپے ماہوار کے حساب سے تین سو روپے فیض محمد کے روپے بینک میں کھاتے میں جمع ہوتے رہے۔ ــــــ پھر جیٹھ کی بارشوں میں فیض محمد کا بیاہ دھوم دھام سے ہو گیا۔ بقول دین محمد "چھوٹی سی اچانک سی بہو۔ دین محمد کے گھر میں نہیں اپنے ماں باپ کے ہی گھر آگئی۔ کیونکہ اس کے ماں باپ "قاضی" ذرا اونچی ذات کے اور دین محمد سے ذرا خوشحال تھے۔ اور دوسرے گاؤں نہوڑیاں میں رہتے تھے۔ فیض محمد اب بوٹ پہنتا اور ہتھوں کی بجائے۔ آگے خوشبودار تیل سے گھونگریالے بال بناتا تھا۔ اس لئے قاضی جی لڑکے کی سج دھج پر مرمٹے۔ اور بیاہ میں یہ شرط ٹھہری کہ لڑکا سسرال میں ہی کچھ عرصہ گھر جوائی ہو کے رہے گا۔ دین محمد نے اونچے گھرانے سے ناطے کی خوشی میں یہ سب کچھ قبول کیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں فیض کا تبادلہ اپنے گاؤں سے سسرال کے گاؤں دہوڑیاں میں ہو گیا۔

اور بیچارا دین محمد جیسا پہلے تھا ویسا ہی رہ گیا۔

چھنوں شاہ کا "ترچھا" اب باراں بیاں سے ادھر جا پہنچا
ماسٹر حنیف محمد اب گاؤں سے شہر میں سائیکل پر آتا جاتا تھا اور
دین محمد کے کندھوں پر لکڑی کا بوجھا برابر اٹھلاتا جا رہا تھا۔ —
کئی بار لکڑی کے گٹھے کے پیچھے سائیکل کی گھنٹی بج اٹھتی اور لکڑیوں
کا گٹھا کنارے ہٹ کر راستہ دے دیتا۔
سائیکل پر بیٹھے حنیف محمد کی مسکراہٹ کی جھلک دور ہوتے ہوتے
افق میں ڈوب جاتی۔
پھر دین محمد کے ہونٹوں پر بھی مسکان ناچ اٹھتی —— کیوں ——
یہ دن آپ بھی نہیں جانتا تھا۔
چھنوں شاہ کا سود بڑھتا جا رہا تھا۔ اور سود چکانے کے تمام ذرائع
مسدود تھے۔

دین محمد کی کمرِ ہمت دن بہ دن ٹوٹ رہی تھی۔
ایسے میں دین محمد کی دعا باریاب ہو گئی۔
بھوری نے کٹی جنی — اور دین محمد کا دلدر کٹ گیا۔ دین محمد کے بال
بچوں کی عید کی تقریب کئی دن چلتی رہی۔ بھینس کی دھار اور بھوری سے
سب سیراب ہوئے۔ پھر دہی کا دور چلا۔ آخر میں صرف کھٹی لسی پر ہی بات
آ ٹھہری۔ کیوں کہ
"مکھن چھنوں شاہ کا تھا اور بھوری دین محمد کی۔

آج آٹھ دن سے دین محمد کے دیدار نہیں ہوتے —— نہ جانے کیوں

گھر میں لکڑیوں کا ٹوٹا پڑ گیا ــــ بچے دین محمد کی پول ڈھونڈتے تھے
فٹ پال میں وہ لطف، کہاں. جو دین محمد کی پول کی اچھال میں ملتا ہے ــــ غرض
کہ ہم سب پریشان سے ہو گئے۔
دین محمد کا گھر پورے پانچ کوس دور پہاڑ کی گھاٹی پر واقع تھا.
میں صبح ہی صبح گھر سے چلا تھا. تنگ سے پہاڑی راستوں پر بھٹکتا
آخر دس بجے کے قریب. دین محمد کا گھر نظروں میں آ ہی گیا. قصبہ کے سرے پر
رہی کے گھنے جنگل کے دامن میں دین محمد کا اکیلا گھر یوں اداس اداس سا
لگ رہا تھا جیسے جنگلوں میں بھٹکتا شکاری کسی شکار کو نہ پا کر گھنے درخت کی
چھاؤں میں چپ چاپ بیٹھا تھکن اُتار رہا ہو۔
دین محمد کے کوٹھے کے برآمدے میں دھول سی اڑ رہی تھی۔ کنارے کی
گھاٹ پر نہی دریدہ کالی لوئی تانے دین محمد منہ سر لپیٹے اوندھے منہ پڑا
تھا۔ پاس ہی دو چار نیم برہنہ بچے یوں بیٹھے تھے. جیسے مری بھینس کے قریب
چمر گدھ ــــ دین محمد کی مہری چولہے میں پھونکیں مار رہی تھی۔ اور چولہے
کی راکھ اڑ اڑ کر یوں اس کے سر میں پڑ رہی تھی۔ جیسے قصبہ کی اونچی چوٹی پر برف
کی ہلکی تہہ جم رہی ہو۔
کیا حال ہے دین محمد کا ــــ مہری کی پھونکیں رک گئیں۔ اس کی
حیران نظریں جن میں ویرانی جھلک رہی تھی۔ میری طرف اٹھ گئیں۔ اور
سوالیہ نشان بن کر رہ گئیں۔
میں شہر سے آیا ہوں ــــ آج کتنوں سے دین محمد ہو گیا ــــ
مجھے اپنے نامکمل فقرے کو ہونٹوں میں ہی دبانا پڑا۔ ــــ کتنا خود غرض انسان
ہوں میں ـــ

مہری صورت حال سمجھ گئی۔ ایک میلا سا مونڈھا پیچھو کی پیش کرتے ہوئے بولی ـــــ بیٹھو نا۔

ہم جی کاں کو دیں محمد ـــــ اج اتھاں رہیاں توں کہا تو نہیں۔ پیٹو نیئں بس لگے تے ہوتے۔ لگے تے رہتے۔ ڈھائیں مار رو تو بھی جائے۔

"بات کیا ہوئی۔ آخر ـــــ کیا بیماری لگ گئی اسے ـــــ میں جھنجھلا سا اٹھا۔

نیم برہنہ بچوں میں سے ایک بول اٹھا۔

"رے پار کا بھوری نا لے گیا ایں ـــــ

"بھوری کو سے گئے ـــــ کون؟

اس کے مہری نے بچوں کو ڈانٹتے وضاحت کی ـــــ

کئی ہفتوں سے سرحد کے پار کے پاکستانی مجاہدوں نے رات میں بارڈر پولیس کی نظروں سے بچتے گاؤں بھر میں جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ جس کسی گھر میں اناج بھیڑ بکری یا ٹونی ڈنگر دیکھتے ہیں۔ بندوق دکھا کر لوٹ لے جاتے ہیں ـــــ بھوری بھی ان کی نظر پر چڑھ گئی ـــــ دن میں ہی جب بھوری گھاس چرتے جنگل کے سرے پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پار کے اکو ہانک کر لے گئے۔

دین محمد کی بیماری اور ڈھائیں مار کر رونے کا راز سمجھ میں آگیا۔

اتنے میں دین محمد کھاٹ پر سے اٹھ بیٹھا ـــــ پھٹی پھٹی نظروں سے چھت کو گھورتے چلا اٹھا۔

پار کے سور ڈاکو ـــــ میری بھوری ـــــ میری بھوری ناں ـــــ

گئے ... ان اہتاں بے ایماناں کولوں بھوری ناں لیاں گا ...

لیا دیگا بھوری ناں ظالماں کو دیں۔

یہ کہتے کہتے دین محمد پاگلوں کی طرح منہ سے جھاگ اڑاتا ___ بھاگ نکلا ___

ہم سب دین محمد کے پیچھے دوڑ پڑے ۔ دین محمد چلاتا چیختا پہاڑ کی چوٹی کے درے کی طرف جا رہا تھا ___ درے کے اس پار ہندوستانی پاکستانی فوجوں کی چوکیوں کی طرف منہ بھاگتا دوڑتا چلا جا رہا تھا ۔

وہاں آ ہے سرکار کی ۔ وہاں میری بھوری بھینس ہماں ٹھا دیو ہے

ایما تو میری بھوری ___ پھر دین محمد کی آواز کے ساتھ مہری کی رونے ہچکیوں کی آواز صدائے بازگشت بن کر گونج اٹھی ۔

" نہ جا مہنگا اُت نہ جا ۔ اُت موت ہے ۔ اُت بھوری نہیں ۔ موت کے منہ ماں نہ جا ۔ "

" لوٹ آ ___ دین محمد ___ لوٹ آ ___ وہاں بھوری نہیں ملے گی ۔ ہاں موت ہے موت واپس آ ۔

(موت کے منہ میں مت جا ۔ لوٹ آ ۔ دین محمد لوٹ آ ۔

مگر دین محمد کی آواز دور ہوتے ہوتے جنگل میں کھو کر تحلیل ہو گئی ۔

مہاں تری نہیں بھوری کی ضرورت ہے بھری ۔ ہم ن پاکستانی سردار نال لڑوں گو ۔ ہم ن بھوری ناں لیاں گا ۔

اور بھوری کے ساتھ دین محمد اور اس کی آواز بھی گھنے جنگل میں ڈوبتی چلی گئی ۔

دین محمد کی مہری کی ڈبڈبائی آنکھیں آج بھی دین محمد سے پوچھ رہی ہیں ___ کب تک میں چشم وا کو رکھوں وقف انتظار

نہ جانے دین محمد کی چوری کیسے کہ کب ٹوٹے گا — ہمارے گھر میں لکڑیوں کا ٹوٹا پڑ رہا ہے

اندر بچے دین محمد کی پول کی تلاش کرتے پھر رہے ہیں — فیض محمد بدستور سائیکل چلا رہا ہے۔

اور ہم سب کسی انجانی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
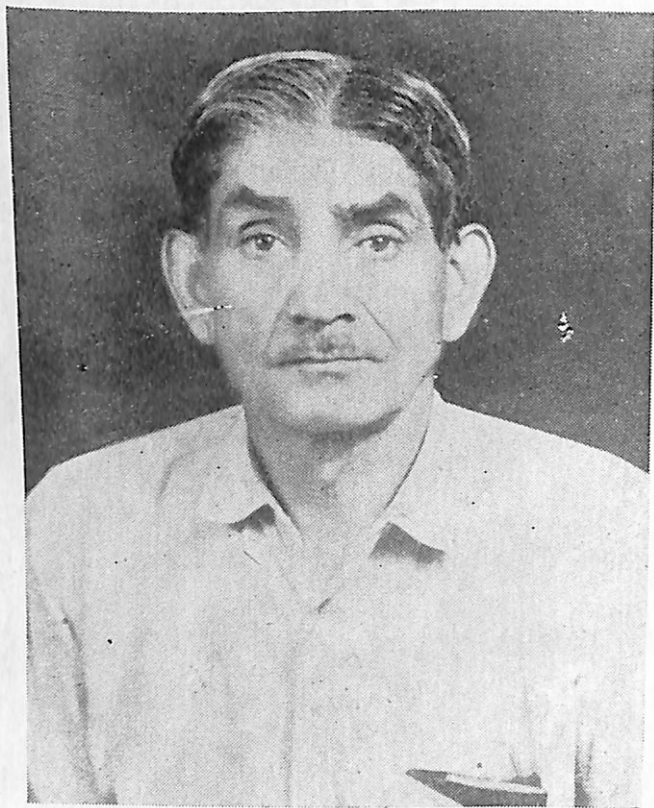
شری دیانند کپور

ریڈیائی ڈرامہ

تاج محل

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

پس منظر: وقت شام۔ بارش اور ہواؤں کا طوفان۔ پی۔ کے باسو انجینئر کی شاندار کوٹھی کے لان میں مجید خاں معمار۔ جو دیوانگی کے عالم میں آوارہ پھرتا ہے بارش کے طوفانی تھپیڑوں سے پناہ لینے کے لئے کوٹھی کے لان میں آگھستا ہے۔ انجینئر اور اس کی بیوی لتا باہر جانے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ بارش ذرا تھم

چکی ہے۔ لتا لباس بدل کر کمرہ میں آتی ہے۔ جہاں
باسو کام میں مصروف ہوتا ہے۔

لتا :- اپنے آپ سے۔ او۔ ساڑھے آٹھ ہو گئے۔ اف کتنی سنسناتی
ہوا" چل رہی ہے " بارش تو ختم چکی ہے مگر۔ کیوں ! ڈارلنگ
چلنا ہے۔

باسو = ہاں۔ ہاں۔ مگر یہ بارش۔ ہوا۔ اور.....

لتا = بارش ختم چکی ہے۔ (ہی ہی ہی ہنستی ہے) ہوا کے جھونکوں سے
ڈر رہے ہو جب ہم شکاگو (امریکہ) میں تھے تو برف کے گالوں سے
کھیلتے تھے۔ آج اتنے نازک مزاج......

باسو = بات کاٹتے ہوئے بے صبری سے۔ بس۔ بس چلتا ہوں۔ ذرا یہ
پل کا اسٹیمیٹ دیکھ لوں۔ ایمرجنسی کام ہے نا۔ کار تیار ہے۔

لتا = لان میں کھڑی ہے۔

باسو = تو چلو بیٹھو کار میں۔ میں بھی دو منٹ میں آ پہنچا۔

لتا = سینما پہنچتے پہنچتے ساڑھے نو ہو ہی جائیں گے۔ بازار میں تھوڑی
سی شاپنگ بھی کرنی ہے۔

باسو۔ تو کر لینا۔ بہت ٹائم ہے۔ پکچر تو پونے دس شروع ہوتی ہے۔

لتا = اچھا تو میں چلتی ہوں۔

باسو = او۔ کے تم بیٹھو میں آیا۔

(لتا جاتی ہے قدموں کی چاپ وقفہ)

(دروازے کے پٹ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی بے ہنگم قہقہے اُبھرتے ہیں)

مجو = کراہتے ہوئے) او۔ او۔ اف۔ (پھر قہقہہ) ہو۔ہو۔ہو۔ہا۔ہا۔ہا۔

لتا = خوفزدہ) او۔ تم۔ تم کون ہو۔ کون ہو تم اس اندھیرے میں بیٹھے۔

مجو = جواب میں قہقہہ اُبھرتا ہے) ہاہا۔ ہو ہو۔ بتاؤ۔ تو سہی میں کون ہوں؟

لتا = چیختے ہوئے پکارتی ہے) باسو۔ ڈرلنگ باسو۔ جلدی آؤ۔ دروازہ میں چور بیٹھا ہے۔

(باسو آتا ہے قدموں کی چاپ)

باسو = کیا ہے لتا ڈرلنگ۔ او۔ یہ۔ کون بیٹھا ہے۔

لتا = ہانپتے ہوئے رک رک کر) کیا جانوں۔ چوکھٹ سے لگا بیٹھا تھا۔ جونہی پٹ کھلے اندر گر پڑا۔ کوئی چور ہوگا۔

(پس منظر میں چیختی ہواؤں کا شور جاری ہے۔)

باسو = کون ہو تم؟ بولو۔ بولتے نہیں۔ کیا چور ہو؟

مجو = چور۔ نہیں میں چور نہیں۔ میں مجو ہوں۔ مجو!

باسو = کوئی پاگل ہے۔!

مجو = پاگل۔ ہاہا۔ مجو پاگل نہیں۔ فنکار ہے۔ استاد مجو۔

لتا = یہاں کیوں آ بیٹھے۔

مجو = کیوں۔ آ بیٹھا۔ اس بارش سے پوچھو۔ اس گرج چمک سے

پڑپچھو۔ ان چیختی ہواؤں سے پوچھو! مجو یہاں کیوں آبیٹھا۔ یہ دہلیز یہ چوکھٹ یہ محراب یہ ستون۔ ستونوں پر پھولوں کی بیل مجو کے ہاتھوں نے بنائی ہوئی ہے۔ استاد مجو کے ہاتھ دن بھر چونا گارا تھوپتے رات کو کرنڈی سے صفائی کرتے تھے۔ مگر آج۔ گرجتے طوفان میں استاد مجو دہلیز کی آڑ میں پناہ نہیں لے سکتا۔ وہ یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔

مجو! جو کبھی اس عمارت کی اینٹ اینٹ میں سویا ہوا تھا۔ ہاہاہا ہو ہو ہو۔

باسو: بدقسمت بوڑھا اگلے وقتوں کا مزدور جان پڑتا ہے۔

لتا: ایسے ہی مزدور چور بھی ہوتے ہیں۔

باسو: نہیں۔ یہ چور نہیں کوئی دکھیا جان پڑتا ہے۔ طوفان سے بچنے کیلئے یہاں آبیٹھا دیکھو چیتھڑوں سے پانی نچڑ رہا ہے۔

لتا: ذرا آگ سینک لے بچارا۔ تھر تھر کانپ رہا ہے۔

باسو: ہاں۔ اسے چائے بھی چاہیئے۔ اندر آجاؤ مجو کمرے میں انگیٹھی کے پاس۔ بارش میں بھیگے ہو۔

مجو: مجو کمرے میں۔ نہیں مجو کا اب کوئی کمرہ نہیں ہے کوئی مکان نہیں ہے۔ مجو بارش میں بھیگتا ہے مجو دھوپ میں تپتا ہے۔ مجو تپتی بھٹی کی پکی اینٹ ہے۔ جو پانی کو پی لیتی ہے دھوپ کو پگلا دیتی ہے۔ چونے گارے میں سمٹ جاتی ہے۔ استاد مجو اب خالص وہ ہے کا ہتھوڑا! ہے ہتھوڑا؟

باسو :- مجو۔ ہتھوڑے کی نوک بھی تو بھٹی میں تپ کر ہی سنورتی ہے ۔ اندر آجاؤ تمہیں گرمی کی ضرورت ہے۔

مجو :- ہاں۔ مجو کو گرمی کی ضرورت ہے۔ مجو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ وہ مجو جو کبھی گرم تھا اب ٹھنڈا ہے۔

(مجو اندر کمرے میں جاتا ہے قدموں کی چاپ)

باسو :- یہاں بیٹھو۔ مجو۔ کرسی پر انگیٹھی کے سامنے!

مجو :- انگیٹھی کے سامنے؟ ہاں یہ انگیٹھی اس کی خوبصورت کانس محراب مجو ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ بیلے۔ یہ کھردرے یہ کلّڈ سے زخمی ہاتھ دیکھتے ہو نا۔ ان ہاتھوں نے نہ جانے کتنی ہی ایسی خوبصورت انگیٹھیاں بنائیں۔ جانتے ہو۔ نہیں جانتے۔ تب تم چھوٹے تھے بہت چھوٹے ......

(کتا غرّاتا ہے)

باسو :- ٹام چپ رہو۔ جانتے نہیں یہ مجو ہے۔

مجو :- ٹام کیوں۔ ٹام پہچانتے ہو۔ نہیں مجو کو اب کوئی نہیں پہچانتا۔ ٹام بھی نہیں۔

(اندر سے لتا آتی ہے)

لتا :- مجو۔ لو۔ یہ کمبل اوڑھ لو۔ ٹھٹھر رہے ہو؟

باسو :- ارے یہ تو میرے بستر پر کا کمبل ہے!

لتا :- تو کیا ہوا؟ مجو کہاں رہتے ہو۔

مجو = ہنستا ہے، مجو کہاں رہتا ہے؟ استاد مجو رہتا ہے شہر کی نیلی پیلی کوٹھیوں میں۔ اونچی سفید حویلیوں میں۔ یہ سب کوٹھیاں تو مجو ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ مگر اب مجو ان میں نہیں رہتا۔ سورگ آشرم میں سورگی شاہ رہتا ہے فردوس منزل میں فردوس خان۔ یہ خان اور شاہ تب کہتے تھے واہ مرزا عجیب خان فن معماری تم پر ختم ہے۔ تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے جادو۔ اینٹوں سے باتیں کراتے ہو گارے میں روح پھونکتے ہو۔ واہ

باسو = ہنستا ہے، لتا ڈارلنگ۔ سن لیا پورا لمبا چوڑا نام جواب مجو کے کوزے میں سکڑ کر رہ گیا ہے۔ او۔ لتا کہاں چلی گئیں تم۔ میں نے کہا ایک پیالہ چائے چاہیئے مرزا عجیب خاں کیلئے۔

(لتا کی آواز اندر سے آتی ہے)

لتا = لائی

(چائے کا پیالہ آجاتا ہے)

باسو = آ گئی چائے۔ گڈ

مجو = چائے۔ مجو کیلئے چائے۔ ہنستا ہے، ہاہاہا۔ کبھی! مجو بھی چائے پیتا تھا۔ دودھ والی میٹھی چائے۔ اور وہ۔ نج۔ بغیر دودھ کے کڑوی چائے پیتی تھی۔ مجو کی آنکھ بچا کر۔ چار روپے روز۔ مجو چار روپے روز کا مزدور ہی تھا۔ نہ وہ بھی جیب دھوپ چمکتی ہو۔ اور بادلوں کے دن وہ چپ چاپ چولہے کے پاس بیٹھے راکھ کرید تی رہتی اور مجو

مرتے سے سویا رہتا تھا۔ وہ مجو کی بیگم نجمہ تھی۔ یہی نام تھا نا اُس کا نجمہ بیگم۔ میں اسے پیار سے نجو کہہ کر بلایا کرتا تھا۔

(لتا ٹکٹکی باندھ کر مجو کو دیکھ رہی تھی)

یاسو: لتا یوں ٹکٹکی باندھے کیا تک رہی ہو۔ چائے کی پیالی بنا دونا۔

(چائے کی پیالی بڑھاتی ہے)

لتا: یہ لیجئے؟

باسو: پیالی بڑھا کر، چائے پی لو۔ اُستاد؟

مجو: ہنستا ہے، ہا ہا ہا۔ سنہری پیالی میں چائے۔ (اپنے آپ سے) مجو سنہری پیالی میں چائے پی۔ کم بخت مجو تو نے کبھی سنہری پیالی میں بڑھیا چائے نہ پی ہو گی۔ تو کیا جانے۔ نقشہ۔ لیول۔ کمپاس۔ پیمانہ کیا بلا ہوتے ہیں۔ ارے تو مٹی کے پیالہ میں چھا چھ پینے والا چونے گارے پر کرنڈی پھیرنے والا مزدور ہے۔ یاد ہے مجو اسی کمرے میں اسی انگیٹھی کے سامنے تیرا مٹی کا پیالہ تیرے منہ پر مارا گیا تھا بڑے صاحب خفا ہو گئے تھے وہ گرجتے تھے برستے تھے۔ اور پھر ــــ پھر تجھے اس کمرے سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ ولایت پاس انجینئر تھے نا اور مجو غریب مزدور تھا۔

یاسو: ارے یہ تو پتا جی کی بات کر رہا ہے شائد؟ (لتا کی صم بکم حالت دیکھ کر)

[illegible]

میں ....

لتا = چونک کر، نہیں۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ؟

باسو = پھر بھی۔ کچھ ہے۔

لتا = بڑبڑاتے ہوئے، یوں ہی۔ یہ آنکھیں یہ ناک نقشہ کچھ سپنا سا.... یاد آرہا ہے........

باسو = سپنا سا یاد آرہا ہے۔ کیا مطلب : کوئی بھولا بسرا خواب !

لتا = نہیں۔ کچھ بھی نہیں ؟

باسو = کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ نا آرام کرسی پر۔ سینما چلنا ہے نا

لتا = نہیں ؟

باسو = کیوں۔ کیا ہوا۔ طبیعت تو اچھی ہے نا۔

لتا = کیا ہوا مجھے۔ ٹھیک تو ہوں۔

مجو = ہنستا ہے، ہا ہا ہا۔ یہ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ مگر یہ انگیٹھی کی دیوار ٹھیک نہیں۔ ولایتی نقشے اور کمپاس تو اسے ٹھیک نہیں کر سکے۔ ٹھیک ہی تھا جو بے علم مجو کی کرنڈی نے کیا تھا — وہی ٹھیک تھا۔

باسو = مجو سچ کہو۔ تم پتا جی کو جانتے تھے۔

مجو = جانتا ہوں۔ انہیں بھی جانتا تھا۔ تمہیں بھی جانتا ہوں۔ وہ باپ تھے تم بیٹے ہو۔ تم بھی ولائت پاس ہو وہ بھی ولائت

مکان - ان مکانوں میں رہنے والے اُجلے انسان کیا - کچھ نہیں - تم کرنڈی کی صفائی دیکھتے ہو - اور پتلون کی کریز - یہ سب کرنڈی کی صفائی اور اجلی پتلون کے کریز کے شہر ہیں - تاج محل بھی کرنڈی کی صفائی ہے اور تمہاری اجلی پتلون کی کریز بھی صفائی کا فن ہے - لوگ شہروں میں آکر یہی دو چیزیں دیکھتے ہیں - - پتلون کی کریز اور کرنڈی کی صفائی - ہنستا ہے ہاہاہا -

باسو = کیوں مجو! اس کوٹھی کے معمار تم ہی تھے -

مجو = ہاں - - اول سے آخر تک میرے ہی ہاتھوں نے اسے بنایا ہے -

باسو = اچھا تو اس انگیٹھی کے جھگڑے کی کیا بات ہوئی تھی - میں کچھ سمجھ نہیں پایا -

مجو = جھگڑے کی بات - کسی جھگڑے کی بات نہیں تھی - میں مزدور تھا وہ مالک تھے - مزدور نے اپنی کہی - مالک نے اپنی کی - نتیجہ - نتیجہ دیکھنا چاہتے ہو - تو لو دیکھو - روشنی میں دیکھو - یہ محراب کو چیرتی ہوئی پتلی لکیر نظر آرہی ہے - یہ لکیر نیچے سے اوپر تک دیوار کو چیرتے جا رہی ہے - کیوں دیکھ رہے ہو نا -

باسو = ہاں دیکھ رہا ہوں - دیکھ ہی نہیں بلکہ اس درز کی کئی بار مرمت بھی ہو چکی ہے مگر ہر مرمت کے بعد یہ لکیر پھر نمایاں ہو جاتی ہے -

مجو = ہنستا ہے، ہاہاہا - ہاں یہ درز مرمت سے کبھی نہیں مٹے گی - یہ درز محراب اور دیوار کو چیرتی ہی جائے گی اس ہی بات تھی سمجھے

باسو = بس یہی بات تھی = ہونہہ ؟

مجو = سننا چاہتے ہو ۔ تو سنو ۔

منظرِ ماضی :- (کوٹھی کی تعمیر جاری ہے، باسو
کے پتا جو بڑے انجینئر ہیں کام کی نگرانی
پر دفتر سے آکر مجو کے پاس کھڑے ہیں
مجو انگیٹھی کی محراب بنا رہا ہے ۔ صاحب
بلاتا ہے ۔)

صاحب = غصّہ سے ، مجو ۔

مجو = جی صاحب !

صاحب = یہ ہے نقشہ ۔ دیکھتے ہو میرے نقشے میں کیا ہے ۔

مجو = جی ۔

صاحب = یہ کونے کی انگیٹھی کی ڈاٹ ستّر ڈگری کی ہونی چاہیئے ۔ تو
نے آج تیسری بار پھر نوّے ڈگری کی بنا دی ۔ یہ تو فیتہ ناپو ۔

مجو = جی صاحب !

صاحب = غصّہ سے ، صاحب کے نیچے بول ۔ کیا یہ جھوٹ ہے ۔

مجو = نہیں جناب

صاحب = تو پھر ؟

مجو = [illegible]

ڈگری کی ڈاٹ ہی ٹھیک رہے گی۔

صاحب = گرج کر، تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔

مجو = نہیں۔ سرکار۔ آپ بڑے انجنیئر ہیں میں معمولی مستری ہوں۔
بات یہ ہے کہ میرے ہاتھ اینٹیں چنتے ہوئے بے اختیار رہی کچھ
بنا دیتے ہیں جو مجھے میرے استاد نے سکھا رکھا ہے۔

صاحب = تم اور تمہارے اُستاد جائیں بھاڑ میں۔ میں کچھ کہتا ہوں اور
میری غیر حاضری میں کچھ اور بنا دیتا ہے۔ اُکھاڑ اِس ڈاٹ کو۔
یہاں ستتر ڈگری کی ہی ڈاٹ رہے گی۔

مجو = جی ۔ یہ ڈاٹ اکھیڑ ڈالوں۔

صاحب = ہاں۔ جلدی کر۔

مجو = حضور۔ ستتر ڈگری کی ڈاٹ دیوار کا بوجھ نہیں سہار سکے گی۔
نیچے سے اوپر تک درز پڑ جائے گی۔

صاحب = بس بکواس بند کر۔ مجھے سکھاتا ہے۔ جس نے سات
سال سمندر پار ولائت میں غرق کیے ہیں تو اپنی استادی رہنے
دے۔ میں جو کہتا ہوں۔ وہی کر۔ سمجھے؟

مجو = جو حکم جناب؟

صاحب = ہونہہ۔ کہتا ہے درز پڑ جائے گی۔ میرے کام کو غلط بتاتا ہے۔
چار ٹکے کا مزدور۔

مجو = ہاہاہا — مجو چار ٹکے کا مزدور تھا نا — وہ بڑے صاحب تھے۔ مجو ہاتھ سے کام کرتا تھا وہ بڑے دماغ سے۔ مجو کے ہاتھوں نے وہی کیا جو بڑے دماغ نے کہا۔ کام ختم ہو گیا۔

باسو = کام ختم ہو گیا — پھر۔۔۔۔۔۔

مجو = پھر کیا — وہی ہوا۔ جو ہونا تھا۔ یہ پتلی سی لکیر پلستر پھاڑ کر باہر آگئی اب اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ بڑے صاحب کبھی اپنے نقشے میں جھنجلا رہے تھے۔ کبھی غریب مجو پہ — آخر مجو کو کام سے ہٹا دیا گیا۔ کیونکہ اُس نے تجربے کی بات پہلے بتا دی تھی۔ اب دیکھ لو۔ کاغذی نقشہ ہار گیا تجربہ جیت گیا۔ کیوں ٹھیک ہے نا (قہقہہ لگاتا ہے۔ ہاہاہا)

(وقفہ)

لتا = مجو۔ تمہارا گھر یہیں ہے نا۔

مجو = قہقہہ لگاتا ہے، مجو کا گھر۔ ہاں مجو کا گھر کبھی یہیں تھا — سامنے آک اور ڈھاک کے جھنڈ میں۔ مجو کے گھر میں۔ مجو کی بجو۔ بجو بیگم رہتی تھی۔ مجو رہتا تھا۔ اور بجو بیگم کی ننھی شہزادی بھی رہتی تھی۔ بجو اور مجو کی ننھی منی

شہزادی — اور — وہ تو سال بھر کی بھی نہ تھی۔ اور — پھر — وہ مر گئی روتے بلکتے — مر گئی — (مجو کی آواز بھاری ہو جاتی ہے)

لتا = تعجب سے، وہ ننھی مر گئی؟

مجو = چلا کر ہاں۔۔۔ کون کہتا ہے وہ مر گئی۔۔۔ نہیں بلکہ حقیقت

ضرور زندہ ہوگی۔ ڈھونڈا تھا نہیں پایا۔ اپنی ننھی منی شہزادی کو۔
جیسے مٹی کے کٹورے میں دودھ پلاتا رہا۔ لوریاں گا گا کر سلاتا رہا۔
سوتے سوتے رو پڑتی تو مجو بھی رو دیتا۔ وہ ہنستی تو مجو بھی ہنس پڑتا۔
وہ مجو کی لاڈلی تھی نا۔ ہماری ننھی شہزادی ——

یاسو = مجو تمہاری نجمہ بیگم تو گھر میں ہوگی۔؟

مجو = گھر میں۔ ہاں۔ اب آرام سے سوئی پڑی ہے گھر میں۔ کتنے ہی سال
کتنے ہی مہینے وہ آرام سے نہیں سوئی تھی جاگتی رہی بھوکی پیاسی اور
بیمار نجمہ! جاگتی رہی مگر اب تو وہ بیمار نہیں ہے بھوکی نہیں وہ
چادر تان کر سوئی پڑی ہے۔ جگاتا ہوں تو نہیں جاگتی۔ بلاتا ہوں تو
نہیں بولتی "مجو" سے نجو ناراض ہے۔

لتا = حیرت سے ناراض ہے

مجو = بھرائی آواز میں، ہاں۔ مجو سے ناراض ہے۔ اُس نے کہا تھا سرہانے
کا طاق۔ بہت خوبصورت طاق۔ بنانا۔ سنگ مرمر کا طاق۔ پھولوں
سے بھرا ہوا طاق جس میں دیا جلتا رہے۔ میں طاق نہیں بنا سکا۔ یہ
طاق نہیں بن سکا۔ نہ جانے کیوں رزور سے) نہیں۔ نہیں یہ طاق
ضرور بنے گا۔ مجو فن کار ہے۔ اُس نے کتنے ہی خوبصورت طاق
بنائے ہیں۔ مجو کے ہاتھ۔ مٹیوں میں روح پھونکتے ہیں ڈھیلوں
میں جان ڈال دیتے ہیں۔ یہ طاق ضرور بنے گا پھولوں میں دیا جلے گا۔
نجو کے سرہانے کا طاق۔ ڈھونڈھو نجو "بن جائے گا"

باسو = اوہ تو "بجو" مر گئی۔
مجو = ہاں۔ بجو مر گئی۔ مجو بھی مر گیا۔ فن کار مجو۔ بجہ بیگم کے شیش محل کے خواب پورے ہو گئے۔ اب بجو کے شیش محل میں بھنگ اور دھتورے کی بہار چھا رہی ہے۔ سنتے ہو بھنگ اور دھتورے کی بہار۔ (قہقہہ لگاتا ہے)
باسو = تو کیا بیمار تھی وہ ؟
مجو = بیمار ــــ ہاں بھوک کی بیماری تھی۔ حکیم نے کہا میعادی بخار ہے اسے انگوروں کا رس پلاؤ۔ (قہقہہ لگاتا ہے) انگوروں کا رس تین تین دن کے فاقوں میں انگوروں کا رس ــــ مگر اب تو میری بجہ کو انگوروں کا رس نہیں چاہیئے ــــ وہ تو انگوروں کا رس پینے ہی تو گئی ہے۔ انگوروں کے باغ میں ــــ
لتا = اور وہ بچی ؟
مجو = بچی۔ ہاں۔ ہماری بچی کو پیسے ہوئے چاولوں کے دودھ کا کٹورا ملتا تھا وہ دودھ پی کر مجو کی گود میں سوئی رہتی ــــ بجو بیمار تھی اور مجو بیکار تھا کیونکہ اب اسے چار روپے روز نہیں ملتے تھے ــــ ایک ایسی ہی طوفانی رات تھی وہ ــــ بادل گرج رہے تھے ــــ اور مجو کا "محل" ہر گرج سے لرز رہا تھا۔ بچی بلک بلک کر سو چکی تھی۔ اور دیا جھلملا رہا تھا۔ بیمار بجو کراہ رہی تھی اور فن کار مجو جاگ رہا تھا ــــ

ا ماضی کا منظر اُبھرتا ہے۔ مجو کا جو کان
تھا جھونپڑا۔ کھپریل کا چھت ٹیڑھی ترچھی
دیواریں۔ سیلا فرش۔ ایک کونہ میں
چولہا اور چند برتن پڑے ہیں۔ دروازے
کے سامنے ٹوٹی سی کھاٹ پر نجمہ چیت
لیٹی ہے مجو فرش پر بیٹھا ہے۔ جھکڑ
اور بارش کے ریلے سے درو دیوار
کانپ رہے ہیں چھت ٹپک رہی ہے۔
اور دیا جھلملا رہا ہے۔)

نجو : بیہوشی میں چونک کر کراہتی ہے ، اد۔ آہ ۔ مجو ۔ مجو ۔ جاگتے ہو۔

مجو : ہاں

نجو : بیہوشی میں بڑبڑاتی ہے ، مجو ! یہ دیوار ۔ سامنے کی کچ جج دیوار دیکھتے ہو۔ نا۔

مجو : ہاں

نجو : یہ میرے سر پر آرہی ہے ـــــ یہ مجھے ۔ کچل دے گی۔ اسے تھامو تھام لیا۔ نا۔

مجو : نجو ! ہوش میں ہو۔

نجو : بیہوشی سے ہوش میں آتی ہے ، اد۔ میں کیا بڑبڑا رہی تھی ۔ کوئی

بُرا خواب دیکھ رہی تھی — ہائے — میری پیٹھ میں درد ہو رہا ہے۔
لیٹے لیٹے میں بیٹھوں گی — مجھے سہارا دو — میں بیٹھوں گی ....
(بادلوں کی گرج زور سے سنائی دیتی ہے۔ جھونپڑا کانپ

اٹھتا ہے۔)

نجو: آدھی رات ہے نا

مجو: ہاں۔

نجو: مینہ برس رہا ہے؟

مجو: ہاں

نجو: اُف یہ۔ جھکورے کا مینہ۔ یہ گرج۔ یہ بجلی کی کڑک۔ اس گھر کی
ٹیڑھی میڑھی دیواریں۔ یہ گرنے والی چھت۔ سب گرا دے گی۔
گرے گی نا۔ مجو؟

مجو: ہاں

نجو: پھر تم اپنے ہاتھوں سے نئی دیواریں بناؤ گے۔؟

مجو: ہاں

نجو: مسکراتے ہوئے، بہت اچھی۔ پکی سیدھی دیواریں۔ پکا چھت
ہوگا۔ سیمنٹ والا۔ تم پکی چھت ڈالتے ہو۔ نا۔

مجو: ہاں

نجو: پھیکی ہنسی ہنستی ہے، اور میں بھی کیسی پگلی ہوں۔ یہ سامنے کی۔
بڑے صاحب کی کوٹھی تم ہی نے تو بنائی ہے ویسی ہی اپنے گھر کی

دیواریں بناؤ گے نا۔

مجو = ہاں

بجو = رُک رُک کر، جھوٹ۔! تم نہیں بناؤ گے جب میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی تو اس کچے کو ٹھڑے کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ یہاں چوہوں کے بل ہی بل تھے۔ چوہے اور جھینگر۔ توبہ ہے۔ میں نے کتنا ہی گارا تھوپ تھوپ کر سیدھا کرنا چاہا۔ یہ نہیں ہوئیں۔ ویسی کی ویسی ہی رہیں۔ (ہانپتے ہوئے) تب تم کہتے تھے۔ "بجو" چھوڑ دو اس دھندے کو! میں نئی بنادوں گا۔ اپنے ہاتھوں سے۔ کیوں ٹھیک ہے نا........

مجو = ہاں

بجو = اکھڑی سانس سے رُک رُک کر، کتنے سال ہوئے۔ چھ۔ سات نہیں۔ آٹھ سال۔ آٹھ ہی سال ہوئے ہیں نا ہمارے بیاہ کو!

مجو = ہاں۔

بجو = ہانپتے، ان آٹھ سالوں میں تم نے کتنے ہی لوگوں کے مکان بنائے نئی کوٹھیاں بنائیں ــــ مگر اپنے گھر کی یہ ٹیڑھی دیواریں ــــ سیدھی نہیں ہوئیں۔ دوسروں کے لئے رات میں بھی جاگے۔ اپنے لئے۔ دن کو بھی سوتے رہے اب ــــ اپنی "بجو" کے لئے۔ کیا بناؤ گے ــــ وقت بیت چکا ہے۔ مجو میرے کندھے سے لگے تمہارے ہی ہاتھ ہیں۔ نا۔

مجو : ہاں

نجو : کیسے کھُردرے ہاتھ ہیں۔ چونے اور ریت میں سِلے ہوئے ہاتھ! یہ ہاتھ دوسروں کے محل بناتے رہے مگر اپنی جھونپڑی نہیں بنا سکے۔ پھر بھی کتنے اچھے ہاتھ ہیں۔ پیارے ہاتھ؟.......

مجو : چونک کر، پیارے ہاتھ ؟

نجو : یہ میرے دل سے پوچھو؟ یہ سونے کے ہاتھ ہیں۔ نجو۔ بس میں ہوتا تو ان ہاتھوں کے قربان ہو جاتی.......

مجو : کیا کہہ رہی ہو۔ نجو ؟

نجو : کہنے دو — آج سہاگ رات ہے۔ کل دلہن کی رخصتی ہوگی۔ ہاں۔ تو۔ کیا۔ کہہ رہی تھی —— میں.......

مجو : کچھ نہیں — بس سو جاؤ ؟

نجو : سو جاؤں — سو جاؤں گی۔ ہمیشہ کے لئے سو جاؤنگی۔ آج کی رات — آج کی آخری رات کچھ کہنے دو — مجو — بیتے دنوں کی یاد نئی کرنے دو۔ سُنتے ہو۔ کچھ کہنے دو.......

مجو : روندھے گلے سے، تم کانپ رہی ہو" نجو" بخار اُتر رہا ہے شاید یہ پسینہ.......

نجو : ہانپتے، ہاں۔ پسینہ چھوٹ رہا ہے۔ یہ موت کا پسینہ ہے — میں جا رہی ہوں مجو! کہو؟ مجھ سے پیار کرتی ہو؟.....

مجو : روندھے گلے سے، ہاں

نجو = پھیلی ہنسی، سچ ؟

مجو = سچ ؟

نجو = جھوٹ = مرد کا پیار چھلاوا ہوتا ہے۔ پیار کی گہرائیاں عورت کے دل میں پاؤ گے۔ مجو یاد ہے۔ تم میرا بُت "چاند کی رانی" کہہ کر بنانا چاہتے تھے۔

مجو = ہاں۔

نجو = چاند کی رانی کا بُت، بناتے بناتے آٹھ برس بیت گئے۔ تم نہیں بنا سکے۔ مگر میں اپنے "مجو" کے پیار کا بُت سینہ میں چھپائے لئے جا رہی ہوں۔ سُنتے ہو "مجو"۔ تمہارے بُت میں اپنی روح ڈال کر لئے جا رہی ہوں۔ تم اسے نہیں پا سکتے۔ پیار کا بُت دلوں میں رہتا ہے۔ سنگِ مرمر کے بُت میں نہیں .... (آواز لڑکھڑا جاتی ہے)

مجو = تمہاری سانس اُکھڑ رہی ہے۔ نجو۔ لیٹ جاؤ۔؟

نجو = کھانستی ہے رُک رُک کر، ہاں۔ مجھے لٹا دو۔ میں تھک گئی ہوں اُف، تم بھی کانپ رہے ہو۔ بھوکے ہو گے۔ "مجو" کچھ کھا لو۔ سُنتے ہو۔ تمہیں میرے سر کی قسم کچھ کھا لو۔

مجو = کچھ کھا لوں ؟

نجو = ہاں۔ ہنڈیا میں تھوڑے سے ستو رکھے ہیں۔ سُنتے ہو ؟

مجو = ہاں۔

نجو = نحیف آواز میں، پانی میں بھگو کر کھا لو۔ ستو کھا لو؟ مجو

منجو = سنتو — وہ تو کھا لئے ؟

بنجو = ڈوبتی آواز میں، تم نے کھا لئے نا۔

منجو = نہیں۔

بنجو = پھر کس نے ......

بنجو = چوہوں نے۔

منجو = (چونک کر) ہاں ! چوہوں نے۔

(بنجو کراہتے ہوئے سسکی بھرتی ہے)

بنجو = منجو سنتے ہو

منجو = ہاں !

بنجو = میرا گلا رک رہا ہے۔ زبان سوکھ رہی ہے، تھوڑا سا پانی دو —
ٹھنڈا پانی ......

منجو = ٹھنڈا پانی — حکیم نے منع کر رکھا ہے۔

بنجو = پھر — کیا پیوں گی !

منجو = انگوروں کا رس !

بنجو = انگوروں کا رس۔ انگور میٹھے ہوتے ہیں نا۔

منجو = ہاں !

بنجو = جھوٹ، ایک بار تمہارے لائے ہوئے انگور چکھے تھے وہ تو کھٹے تھے۔
جُو !

منجو = [illegible] کے انگور کھٹے ہی ہوتے ہیں

بجّو = کھٹے ہوتے ہیں ۔ ہاں ٹھیک ہے غریبوں کے انگور کھٹے ....

مجو = بجّو ۔ یہ دوا پیو ۔

نجو = دوا — کڑوے سونفوں کا پانی ۔ نہیں ۔ میں نہیں پیوں گی —
اب دوا پینے کا وقت نہیں ۔ دعا کا وقت ہے ۔ چیخکر ، بس دعا کرو — دعا
مانگو — مجو ؟

مجو = دعا ؟

نجو = ہاں یہی دعا مانگو — تمہارے ہاتھوں مجھے قبر نصیب ہو ! میرا
پکا مقبرہ بنانا ۔ اپنے ہاتھوں سے ۔ سنتے ہو — مجو ۔

مجو = روندھے گلے سے ، یہ کیا کہہ رہی ہو ۔ بجّو !

نجو = پھیکی سی مسکان ، دل کی بات کہہ رہی — سُنتے ہو ۔ مجو
وہ تم نے ایک بار کسی بادشاہ کی کہانی سُنائی تھی نا ۔

مجو = بادشاہ کی کہانی ؟

نجو = ہاں — جس نے اپنی بیگم کا مقبرہ بنوایا تھا ۔ بہت بڑا مقبرہ ۔
آگرہ میں —

مجو = ہاں ۔ شاہ جہاں بادشاہ ۔ !

بجو = بس ۔ شاہ جہاں بادشاہ نے جیسا مقبرہ بنایا تھا ویسا ہی بنانا ۔
تم بنا سکتے ہو نا ۔

مجو = ہاں

نجو = کیا نام ہے مقبرے کا یاد نہیں آتا کوئی اچھا نام تھا ۔ روضہ .....

مجو = روضہ تاج محل!

نجو = اس میں ملکہ تاج بیگم سو رہی ہو گی۔ کتنا اچھا نام ہے۔ تاج محل... کتنے اچھے ہاتھوں نے بنایا ہوگا۔ وہ ہاتھ......

مجو = میرے پڑ دادا کے تھے نجو۔

نجو = پڑ دادا کے! تب تم ضرور بنا سکتے ہو۔ وہ بادشاہ تھے نا۔ اور کتنی خوش بخت تھی اس بادشاہ کی ملکہ۔ جس کے تاج محل کو لوگ دُور دُور سے دیکھنے جاتے ہیں۔ اور میرا یہ "شیش محل" جسکی ٹیڑھی میڑھی دیواریں۔ ادھ ڈھی چھت۔ تم سے سیدھی نہ ہو سکی۔ وہ میرے شیش محل کے خواب ـــــ کہاں پورے ہوتے میرے جیتے جی یہ گھر نہ بن سکا۔ اب مرنے پر میری قبر کی دیواریں کیا بنائیں گے؟

مجو = روتے ہوئے، بناؤں گا نجو۔ تم اچھی ہو جاؤ۔ یہ دیواریں شیشہ جیسی بنا دوں گا!

نجو = اچھی! میں تو اب اچھی ہوں۔ اچھا ایک بات کہوں! مانو گے

مجو = ہاں

نجو = لاؤ قول دو۔ تو میں بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔ تو دیا قول....

مجو = ہاں

نجو = اُس بادشاہ اور بیگم میں بہت محبت تھی نا۔

مجو = ہاں۔

نجو = بادشاہ نے محبّت کی یاد میں بنوایا۔ تاج محل۔

مجو = ہاں !

نجو = پھیکی ہنسی، تم ویسی ہی یادگار کیا بناؤ گے۔ وہ بادشاہ تھا۔ تم مجو ہو۔ ہاں میری محبت کی یاد میں میری قبر کا طاق اپنے ہاتھ سے بنانا۔ سرہانے کا طاق۔ جس میں پھولوں میں دیا جلتا رہے — کیوں چپ کیوں ہو گئے۔

مجو = سسکیاں بھرتے ہوئے، ایسے بول منہ سے مت نکالو۔ نجو۔ یہ تمہارے جانے کے دن نہیں۔

نجو = چونکتے ہوئے، بس پھر گئے اپنے قول سے ؟

مجو = نہیں — نجو — قول ہارنے والا نہیں۔ مگر تم کہہ کیا رہی ہو نجو! مجو کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔

نجو = مجو - مجبوری ہے — تم مرد ہو — دوسرا بیاہ کر لینا !

مجو = دوسرا بیاہ — نہیں" نجو" کبھی نہیں۔ زندگی بھر نہیں۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہیں بچاؤں گا۔ نجو — تم میری روح ہو۔

نجو = مجو - مرد بھی برا ہوتا ہے عورت پھول عورت دل کا پیار ایک ہی مرد کو دیتی ہے پھر عمر بھر ساتھ نباہ دیتی ہے۔ تم اس پیار کو بھلانا نہیں۔ بس اتنا ہی یاد رکھنا —

(منتظر نجو کی لڑکھڑاتی سانس سسکیاں
بادلوں کی گرج میں مدغم ہو جاتی ہے)

(نجو بیہوشی کے عالم میں چونکتی ہے)

نجو = مجو ؟

مجو = ہاں !

نجو = یہ دیا — یہ — دیا — بجھ رہا ہے۔

مجو = نہیں تو —

نجو = بتی اکسا دو۔ اُک دی بتی۔

مجو = ہاں۔

نجو = اُف۔ دھند۔ میری آنکھوں کے آگے دھند سی چھا رہی ہے۔ تم کہاں ہو مجو . . .

مجو = پاس ہی تو بیٹھا ہوں۔

نجو = میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ اُچھل رہا ہے۔ اسے میرے سینے میں دبا دو۔ کہاں ہیں تمہارے ہاتھ۔ ارے میرے ماتھے پر — ہاتھ میں ہاتھ دو۔ مجو۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے وداع کرو —— ؟

مجو = روتے ہوئے، گھبراؤ نہیں نجو۔ صبح ہونے کو ہے۔ حکیم کے گھر جاؤں گا۔

نجو = ڈوبتی آواز میں، اب حکیم کیا کرے گا۔ مجو! کہیں نہ جانا۔ یہ وداع کا وقت ہے (جیسے کچھ یاد آ گیا) کہاں ہے۔ میری بچی

مجو = (روندے گلے سے. میری گود میں ـــ

نجو = سوگئی ہے۔

مجو = ہاں !

نجو = آہ ـ میری بچّی ـ تو نے ـ پیٹ بھر ـ دودھ کبھی نہ پایا ـ ماں کی گود کا سُکھ ـــ اور اب ـ خالی گود جا رہی ہوں میری بچّی مجھے بخش دے ـ بخش دینا میری بچّی ـ بول تو میری کوکھ میں کیوں آئی تھی ـــ

مجو = نجو ـ نجو ـ ہوش میں ہو ؟

نجو = (گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی آواز) ہوش میں ہوں ـ مجو ـ میری قبر کے سرہانے کا طاق ! کھولنا نہیں ـــ میرے سرہانے کے نیچے ـ دس ـــ دس روپے پورے ہیں کفن دفن کے لئے ـ (دم گھٹتے ہوئے چیخکر) میری بچّی ! مجو اسے ماں کا پیار دینا ـ اسے پالنا ـ سے رلانا نہیں ـ سنتے ہو ـ میں جا رہی ہوں ـ مجھے الوداع کہو ـــ مجو ـ آہ ـ خدایا دم گھٹ رہا ہے ـ خو ـ خو ـ خدا کے ـ ا ـ د ـ (ہچکی ــــ

(ہچکی کے ساتھ ہی موت کا سایہ چھا جاتا ہے. مجو دھاڑیں مار کر روتا ہے)

منظر ختم ـ وقفہ

منظر بدلتا ہے۔ آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ مجو
چپ چاپ دہلیز میں سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھا
ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔ سامنے سڑک پر ایک کار
کھڑی ہوتی ہے۔ سیٹھ ہیش داس اور اس کی بیوی
کار سے اتر کر مجو کے پاس آ کھڑے ہوتے ہیں)

سیٹھ ہیش داس :- شاید یہی ہے مجو مستری کا مکان ،؟

سیٹھانی = دکھائی تو ایسا ہی دیتا ہے۔ دروازہ میں ہی بیٹھا ہوا ہے۔

سیٹھ = ہاں۔ یہی ہوگا۔ کچھ چپ چاپ سا بیٹھا ہے۔ کیوں بھائی! مجو مستری تم ہی ہو۔

مجو = گھور کر دیکھتا ہے پھر بلند قہقہہ لگاتا ہے، مجو۔۔۔ مجو مستری مر گیا نجو بیگم بھی مر گئی۔ میں۔ میں۔۔۔ مجو ہوں۔ مجو!

سیٹھ = عجیب جواب ہے۔ کوئی دیوانہ ہے شاید؟

سیٹھانی = تم ہی مجو ہو۔

مجو = ہاں۔

سیٹھ = ارے بھائی۔۔۔ ہم تمہیں ہی لینے آئے ہیں۔ جانتے ہو۔ میرا نام ۔۔۔؟

مجو = نہیں؟

سیٹھ = ہم نئی کوٹھی بنانا چاہتے ہیں۔ سنا ہے۔ تم استاد ہو؟

مجو = تعجب سے، استاد۔۔۔ ہاں مجو استاد ہے۔۔۔ مگر اب

جھجو کی استادی اور دل کیلئے نہیں ہو گی۔ جھجو کی استادی پہلے
نجمہ بیگم کا شیش محل بنائے گی وہ شیش محل میں آ کر رہے گی تا
پھر مقبرہ بنے گا۔ سرہانے کا طاق بنے گا۔ تاج جیسا مقبرہ ۔
سنتے ہو بھائی۔ میرے شیش محل میں رہنے والی نجمہ بیگم مرگئی۔
پو پھٹتے ہی مرگئی۔

سیٹھ = مرگئی۔ یہ کس کے مرنے کا ذکر کر رہا ہے۔

سیٹھانی = کہیں اس کی بیوی نہ ہو۔ (اندر جھانکتی ہے) اور ۔ جھانک
کر دیکھو اندر مردہ پڑا ہے۔؟

سیٹھ = مُردہ!

سیٹھانی = ہاں! اندر چلو۔ یہ دیکھو! موت نے بچارے کا جیون سُکھ
ہی چھین لیا ہے۔

سیٹھ = اور تب ہی تو یہ بچارہ اُلٹی سیدھی ہانک رہا ہے۔ غم سے
دماغ ہی اُلٹ گیا ہے۔

سیٹھانی = ایسے جان پڑتا ہے۔ تھوڑے ہی سمے پہلے گذر گئی ہے دیکھیے
جیسے سوئی پڑی ہے۔

(ہیبت سے چادر اُٹھاتی ہے)

سیٹھانی = ہائے بھگوان۔ دیکھیے کتنی سندر استری ہے۔ جوانی
کی موت پرماتما کسی کو نہ دکھائے۔ بچارے جھجو! کی پراربدھ
میں سُکھ نہیں لکھا تھا؟

سیٹھ ؛ افسوسناک لہجہ میں، ہاں ۔ جوانی ہی نہیں ۔ بہت خوبصورت بھی
تھی ۔ افسوس ! مجو بڑے بدقسمت ہو بھائی ۔ ایسی سندر استری
قسمت سے ہی ملتی ہے ؟

مجو ؛ قہقہہ لگا کر، قسمت سے ـــــ ہاں ! "قسمت سے" چاند
کی رانی" ملتی ہے (رو پڑتا ہے) نجو ۔ سُن ۔ سنتی ہے ۔ تجھے
دیکھ کر لوگ کیا کہتے ہیں ۔ کہتے ہیں تو بہت "سندر" ہے
ارے تجھے تو آج تک اس جھونپڑی میں اس طرح کسی نے نہ
دیکھا تھا ۔ ! (سسکیاں بھرتا ہے)

سیٹھ ؛ بھائی مجو ۔ رونے ہنسنے سے کچھ نہ ہوگا ۔ مرد بن کر صبر سے کام لو ۔
اور مُردہ کے کفن دفن کا انتظام کرو ۔ تمہارا اس کا اتنا ہی سمبندھ
تھا ۔

(بچی کے رونے کی آواز آتی ہے)

سیٹھانی ؛ او ۔ یہ ننھی بچی بھی ہے ۔ ہائے بھگوان ۔ موت کا دل بھی کتنا
کٹھور ہوتا ہے ۔ اُف یہ بچی سال بھر کی بھی نہ ہوگی ۔

مجو ؛ چلا کر، یہ ہماری بچی ہے ۔ نجو کی لاڈلی (بچی کو پچکارتا ہے)
چُپ ہو جا بیٹی (بچی زور زور سے روتی ہے) ارے روتی کیوں
ہے ۔ اچھا رو لے ۔ جی بھر کر رو ۔ تجھے انگور کھانے گئی ہے ۔ نہیں
تمہارے لئے انگوروں کا رس لانے ۔ بس مت رو چُپ کر وہ آتی
[illegible]

بچو کی لاڈلی ......؟

سیٹھانی = روندے گلے سے، ہے بھگوان - بچی کے لئے دودھ کا بھی کوئی
پربندھ نہیں۔

سیٹھ = ہاں - کوئی پربندھ نہیں یہ بڑا ظلم ہے غریب پر.....؟

سیٹھانی = سرگوشی میں، سُنتے ہو؟

سیٹھ = ہاں - کہو - ؟

سیٹھانی = یہ بچی ——— یہ - بچی!

سیٹھ = ہاں - ہاں - یہ بچی؟

سیٹھانی = گود لوں گی -؟

سیٹھ = تعجب سے - گود لو گی -

سیٹھانی = اپنی کوکھ کی بیٹی سمجھکر پالو گی ——سیٹھ- ہاں - اولاد سے ترستے
لوگ - بلی کے بلونگڑے بھی پالتے ہیں - لیکن ....

سیٹھانی = لیک ویک کچھ نہیں - بس میں نے کہہ دیا - کتنی سُندر بچی ہے۔
چینی کی گڑیا سی - میں اسے اپنی بیٹی بناؤں گی -

سیٹھ = غصہ سے، لکشمی! کیا کہہ رہی ہو - ایک غیر ہندو مزدور کی
لڑکی گود لو گی - تم سیٹھانی ہو — ایسے ہی سینکڑوں مزدور خادم
ہیں تمہارے ....

سیٹھانی = غصہ اور حقارت سے مزدور کی لڑکی — کتنے چھوٹے خیال ہیں
آپ کے — پرماتما کے نزدیک - سب ایک ہیں - کوئی چھوٹا بڑا

نہیں۔ دیکھتے نہیں۔ یہ معصوم کسی راجکماری سے بڑھ کر بھی
سُندر ہے ۔ آ۔ میری بچی۔ آ۔ نہ رو ......

(بچی ہمک کر مجو کی گود سے سیٹھانی کے کندھوں سے چپک
جاتی ہے)

سیٹھ : نفرت اور غصّہ سے۔ سمجھ نہیں آتا۔ کیا ہوا تمہاری عقل کو!
سیٹھانی : پاؤں جھٹک کر زور سے، میری عقل ٹھکانے ہے۔ بس چپ
رہیے۔ (روتی ہے) آہ : بے ماں کی بچّی۔ میں تجھے لے جاؤں
گی۔ دیکھئے میرے کندھوں کو ننھے ہاتھوں سے تھپ تھپا رہی ہے۔
میں اسے ضرور لے جاؤں گی ۔ میری سوکھی گود ہری ہو گی ۔
میں کچھ نہیں سنوں گی۔ میں۔ کچھ نہیں سننا چاہتی۔
سیٹھ : کچھ سوچ کر نرم پڑتا ہے، مگر اس کا باپ۔ اس سے پوچھے بغیر...
سیٹھانی : بات کاٹتے ہوئے اس سے کیا پوچھنا ہے۔ بیوی کے غم میں
باؤلا ہو رہا ہے۔ بچارا۔ میری مانیے اور چپکے سے ......
سیٹھ : چپکے سے؟
سیٹھانی : سمجھے نہیں۔ کفن دفن کے لئے کچھ دے دیجئے۔ بچارے کے غم کا
بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔
سیٹھ : ہاں۔ ٹھیک ہے۔ مجو بھائی۔ سنتے ہو ۔ یہ بچی ہمیں
دے دو؟

ہو ہماری بچی مانگنے والے ـــ یہ بجو کی امانت ہے ۔ میری بیگم بجو کی نشانی ـــ بولو تم کون ہو ۔

سیٹھ = میں مشہور سیٹھ ہوں بھائی ـــ ہمارے کوئی اولاد نہیں ۔ تمہاری بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر پال لینگے ۔

مجو = چیختا ہوا ، تم ۔ پالو گے ۔ سیٹھ ـــ ہاں ۔ تم پال سکتے ہو ۔ تمہارے بال اصلی دودھ ہے ۔ "مجو" اکے پاس نقلی ـــ پسے ہوئے چاولوں کا دودھ ـــ نہیں ـــ میری بچی ۔ میری گود میں پلے گی یہ نقلی دودھ پیئے گی ۔ ـ یہ بجو کی لاڈلی ہے ۔ سمجھے سیٹھ !

سیٹھ = ذرا سختی سے ، سنو ! اس بے ماں کی ننھی کا پرینده تم سے نہیں ہو سکے گا ۔ تم دن بھر کام کرو گے یا بیٹی کو گود میں لئے بیٹھے رہو گے ۔

مجو = چونکتا ہے ، کام ـ ہاں میں نے کام کرنا ہے ۔ مجو کا مقبرہ بنانا ہے ۔ مجو کے سرہانے کا طاق بنانا ہے ۔ وہ قول لے گئی ہے ۔ سنتے ہو سیٹھ ۔ "مجو" نے قول ہارا ہے ۔ وہ کام کرے گا ۔

سیٹھ = ہاں ۔ تم بجو کے کفن دفن کا انتظام کرو ۔ یہ لو دو سو روپے ہیں ۔

مجو = روپے لوں ۔ انہیں لے کر کیا کروں گا ۔ یہ روپے تو اب "بجو" کو انگوروں کا رس نہیں پلا سکتے ۔ یہ روپے پاس رکھو ۔ "مجو" کو روپے نہیں چاہئیں ۔ اس کے ہاتھ ہیں ۔ یہ ہاتھ ٹیڑھی دیواروں کو سیدھی بنائیں گے ۔ بجو کے شیش محل کی شیشہ کی ہی دیواریں

سیٹھ = یہ دیواریں ـــــ مقبرہ ـ طاق روپے کے بغیر نہیں بن سکتے۔
سنتے ہو استاد مجو ـــــ تم "بجو" کی آخری منزل کی تیاری کرو۔
تمہاری بچی دودھ کیلئے بُری طرح بلبلا رہی ہے۔ ہم اسے لئے جاتے
ہیں ـــــ!

مجو = تم اسے لئے جاتے ہو ؟

سیٹھانی = تم چنتا نہ کرو "مجو"! میں سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ اسے اپنی جان
کے برابر سمجھ کر پالوں گی ـ ماں بنکر ـ؟

مجو = تم ماں بن کر پالو گی ـ ؟

سیٹھانی = ہاں ؟

سیٹھ = مجو ـ اس غم کی حالت میں یہ بچی تمہارے پاس رہی تو بجو
کی طرح بلک بلک کر مر جائے گی ۔ ؟

مجو = مر جائے گی ؟

سیٹھ = ہاں پیسے ہوئے چاولوں پر بچے نہیں پل سکتے ـ یہ بڑی مصیبت
جھیلنا ہوتی ہے تم سے محنت نہیں ہو سکے گی ـ ہمارے گھر میں اسے
چڑیا کا دودھ تک ملے گا ـ شہزادیوں کی طرح پلے گی ـ اور
راجکماری کہلائے گی ـ

مجو = راجکماری کہلائے گی ـ

سیٹھ = ہاں ـ راجکماریوں کی طرح چاندی کے پالنے میں جھولے گی ـ
موٹروں پر گھومے گی ـ

مجو = موٹر وں ــــــــ ؟

(بچی زور زور سے رو پڑتی ہے)

سیٹھانی = سن رہے ہو۔ بچی کی چیخیں۔ یہ دودھ کیلئے بلک رہی ہے۔
ہم اسے لئے جا رہے ہیں۔ موٹر میں ؟

مجو = موٹر میں (قہقہہ) بجو دیکھتی ہو ــ تمہاری بیٹی موٹر میں
جا رہی ہے۔ تمہاری ننھی شہزادی ــ اُسے چڑیا کا دودھ
بھی ملے گا۔ وہ میٹھے انگور کھائے گی۔ سیٹھ کے گھر میں ــ ؟

سیٹھ = اچھا بھائی۔ ہم چلتے ہیں۔ یہ چارپائی پر روپے پڑے ہیں
ایک سو روپیہ اور رکھ دیا ہے۔ یہ میرے نام کا کارڈ ہے۔
جب چاہو ملنے کے لئے ہماری کوٹھی پر آ سکتے ہو ــ خدا تمہیں
صبر بخشے ــ ؟

(سیٹھ اور سیٹھانی بچی کو کندھے سے لگائے موٹر میں جا
بیٹھتے ہیں)

موٹر ہارن دیتے چل پڑتی ہے

مجو = قہقہہ لگاتا ہے "بجو" سنتی ہو۔ تمہاری شہزادی چلی گئی موٹر
کار میں ــ میں نے ــ بیچ ڈالی ہے۔ روپے لئے ہیں سیٹھ سے
تمہارے کفن دفن کے لئے ــ (پھر بڑبڑاتا ہے) "بجو" سنتی ہو؟
تمہارے شیش محل کے خواب پورے ہوگئے۔

(منظر ختم ہوتا ہے۔ ماسو اور لتا گھبرے تاسف سے مجو کی آپ

بیتی سُن رہے ہیں)

خاموش وقفہ ختم ہوتا ہے

باسو = تاسف سے انگلیاں چٹک کر، آہ — کتنی دلدوز کہانی ہے۔ "مجو"! پھر وہ بچی نہیں ملی۔؟

مجو = نہیں — ؟ میں نے بچی بیچ ڈالی تھی نا۔ روپیوں کے بدلے اور — وہ روپے — وہ روپے بھی کوئی چرا لے گیا۔ بجو کا مقبرہ نہیں بنا۔ وہ سو رہی ہے کچھو قبر میں ایک مجو۔ بجو کے لئے انگور ڈھونڈ رہا ہے۔ نہیں ملتے —

(وقفہ)

لتا = روندے گلے سے، اُس سیٹھ کا نام کیا تھا۔

مجو = نام — بھول گیا۔ کچھ اچھا سا نام تھا۔ ٹھہرو۔ کچھ یاد آرہا ہے۔ ہی۔ ہو —

لتا = سیٹھ مہیش داس ؟

مجو = ہاں — یہی نام تھا۔ سیٹھ مہیش داس پارادا والے۔

لتا = پارادا والے — ارے یہ تو پتا جی کا نام ہے وہ پارادا میں رہتے تھے۔

مجو = ہاں۔ وہیں رہتے تھے۔ بڑی سی کوٹھی تھی ان کی۔ جب میں گیا [illegible]

کی کوٹھی میں کوئی اور رہتا تھا۔

لتا : ٹھیک ہے۔ پتا جی پارادالی کوٹھی بیچکر ناگ پور چلے گئے تھے۔

باسو : وہ کیوں ؟

لتا : پارا کی آب و ہوا راس نہ آئی تھی۔ بیمار رہتے تھے۔ کوٹھی بیچکر ناگ پور چلے گئے۔ وہاں نئی کوٹھی بنوالی تھی۔

باسو : مگر ہماری شادی تو بمبئی میں ہوئی تھی۔

لتا : وہ ناگ پور سے کاروبار کے سلسلے میں بمبئی آ گئے تھے۔ میں ناگ پور سے ہی امریکہ پڑھنے کیلئے گئی تھی۔

باسو : اور امریکہ یونیورسٹی میں ہی ہمارا انٹرویو ہوا تھا۔

لتا : ہاں ــــ (مجو سے) مجو۔ ان کی سیٹھانی کا نام لکشمی تھا۔

مجو : لکشمی ــ ہاں ــ یہی نام تھا۔

لتا : مسکراتے ہوئے، مجو بابا اپنی بچّی کی کوئی نشانی بتا سکتے ہو؟

باسو : ہنستا ہے، ہاں بتا دو نا بابا۔ کوئی تعویز۔ کوئی چھلا۔ پراندہ۔

لتا : چڑ کر، ہنسو نہیں باسو ڈارلنگ ! میرا دل کہہ رہا ہے ــ مجھے کچھ محسوس ہو رہا ہے ــ کہ میں ــــ بابا کہو ــ کچھ یاد ہے تمہیں ؟

مجو : قہقہہ لگاتا ہے۔ پھر سنجیدہ ہو جاتا ہے، بابا ــ مجو بابا ــ نجو کی سی آواز میں کوئی بلا رہا ہے ــ مجو ــ سنتی ہو ــ نجو ــ کوئی تمہاری میٹھی آواز میں پکار رہا ہے مجو بابا ــــ

لتا : زور سے، مجو بابا سنتے ہو۔ تمہیں اپنی بچّی کی کوئی نشانی یاد ہے۔

مجو : نشانی - ہاں یاد ہے - گلے میں منکے تھے - پیر جی کے تین منکے ؟

لتا : سبز منکے تھے ؟

مجو : ہاں - سبز - لال دھاگے میں پروئے ہوئے -

لتا : پہچان لوگے ؟

مجو : ہاں ؟

لتا : تو ٹھہرو - دکھاتی ہوں ؟

(لتا اُٹھ کر کمرے کے اندر چلی جاتی ہے)

باسو : زور زور سے ہنستا ہے ، لو کہیں سے یہ سپیروں کے منکے بھی نکل آئے - کہاں غریب مجو - کہاں کروڑوں میں کھیلنے والا سیٹھ جھیشی داس کی اکلوتی لتا - لتا گھر میں ہی بیٹھے بٹھائے فلم کی ریل بنانا چاہتی ہے - (ہنستا ہے) واہ بھئی واہ -

(وقفہ - لتا باہر آتی ہے)

باسو : ارے یہ ہاتھ میں کیا ہے لتا ؟

لتا : کچھ نہیں - (مجو سے) بابا دیکھو - یہی منکے تھے نا -

مجو : منکے ہاں یہی منکے تھے - وہی لال دھاگہ ہے - بچے کے ہاتھ کا بٹا ہوا لال دھاگہ -

لتا : روندے گلے سے ، تو بابا سنو - میں تمہاری کھوئی ہوئی بچی لتا ہوں -

مجو : بیٹی

نتا: ہاں بابا — بجو کی ماں کی نشانی؟
مجو: تو تم میری بیٹی ہو۔
نتا: ہاں۔ بابا (گلے ملتے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے)۔
مجو: تو کہو۔ ایک بار پھر کہو۔ مجو بابا؟
نتا: مجو بابا
مجو: بیٹی —

(بادل کی گرج میں آواز مدغم ہو جاتی ہے)
جھانجھ

••

"تاج محل"

"ایک صوتی ڈرامہ"

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
ہم غریبوں کی محبّت کا اُڑایا ہے مذاق

اگر یہ کہا جائے کہ ساحر کے اس شعر کے تاثر کا عکسِ جمیل یہ ریڈیائی ڈرامہ ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

"دولت" "غریبوں کی محبت کا مذاق" کسطرح اُڑاتی ہے۔ اس صوتی ڈرامہ میں اس کا ہلکا سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

امیروں کی "دولت" سے فن اُبھرتا ہے --- اور "عملی صورت" پاتا ہے پھر اس فن کو عملی صورت میں منصۂ شہود پہ لانے والا فن کار "دولت" کے چمکیلے پس پردہ ڈوب جاتا ہے اور دولت کا نام آگے آجاتا ہے۔

پرکھنے والے :- یہ نہیں پوچھتے کیسے بنا وہ دیکھتے ہیں "کیا بنا" "جب کچھ بنا" تو حسن اور سحر چھا جاتا ہے تو یہ "سحر" دنیا کو مسحور کرتا ہے ہر زبان پکار اُٹھتی ہے واہ سبحان اللہ ؟

"تاج" اینٹوں اور پتھروں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کو حسن بخشنے والے۔ عملی ہاتھ — شہنشاہ کے ہاتھ نہیں تھے — فن کار کے ہاتھ تھے — ان ہاتھوں نے لافانی شاہکار کی تشکیل کی — اور — افلاس کے تاریک گمنام پردوں میں گم ہو گئے کاش وہ ہاتھ جو افلاس کے تاریک پردوں سے ابھرے اور اک شہنشاہ کے "دولت" کے سہارے یادگار محبت چھوڑ گئے۔ اپنی گم نام محبت کا بھی کوئی نشان چھوڑ جاتے — وہ ایسا نہیں کر سکے — کیوں؟ اس کا جواب ماضی کے پردوں پر بھی نہیں اور "حال" بھی لاجواب ہے؟

تاج کی بنیادوں میں بھی محبت دفن ہے اور کسی گمنام گوشہ لحد میں بھی۔ لیکن جہاں بھی ہے۔ محبت "سوز" ہے ساز نہیں۔ آگ ہے — "مذاق" نہیں! شیش محلوں کی آرام گاہوں کی پُر شکوہ زینت وہ شاہکار بنتے ہیں جو مصور کے موقلم کے "چمپئی دھوپ گلابی سایہ" کا عکس جمیل ہوتے ہیں فن کار .... اپنے فن کا پجاری ہوتا ہے — مگر اس کا فن مخملی گدیلوں میں پروان چڑھتا ہے یا رنگ و روغن کی ٹوٹی پھوٹی پیالیوں میں۔ اس راز کی نقاب کشائی آج تک نہیں ہو سکی کہ فن کار کے فن۔ کی اسکی تاریک زندگی سے کیا رشتہ الفت استوار چلا آ رہا ہے۔

ڈی۔ این کپور کا لکھا ہوا یہ ریڈیائی ڈرامہ سرمایہ دارانہ سماج پر گہرا طنز ہی نہیں بلکہ ننکا کی زندگی کا گہرا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے۔ کہانی مختصر مگر پُر معنی ہے جو [illegible] کے "تاج" کی ہوس ناتمام پر ڈبڈبائی بغیر نہیں رہ سکتیں :

صوفی لال کپور

آدم کے بیٹے
کے بعد
جواں سال اور صاحب طرز ادیب نند گوپال باوا
کا حیات پرور افسانوی مجموعہ
زندہ لاشیں
(زیر طبع)
جلد ہی منظر عام پر آ رہا ہے

نند گوپال باوا

کا

ایک اور افسانوی مجموعہ

انصاف

(زیرِ طبع)

جس میں مصنف نے سماج کی بوسیدہ

رسم و رواج پر بھرپور چوٹ کی ہے

جناب نند گوپال بانڈا کا

ایک اور ناول

آتما کی آواز

آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے

آتما کی آواز ابن آدم کو کئی کٹھن منزلوں

سے بچا لیتی ہے بجز اس کے چشم بینا کی ضرورت

ہے۔ ان حالات کی عکاسی اس ناول میں کی گئی

ہے۔

ہندی داں عوام کے پرزور اصرار پر

افسانوی مجموعہ

آدم کے بیٹے

ہندی ایڈیشن میں عوام کے سامنے پیش

خدمت ہے

مرتبہ

نندگوپال باوا

قیمت : تین روپے

ملنے کا پتہ

باوا پبلیکیشنز جموں

جواں سال لیکن پختہ فنکار
جناب نند گوپال باوا
(کا ناول)
امانت
جو تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے
جلد ہی
آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔

جناب بسپتگر ایم اے

کی

بصیرت افروز نظموں کا مجموعہ

ذہن کے آنسو

جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے ہر نظم سے
شاعر کی انفرادیت اور نکتہ نظر کی
وسعتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(انگلش ایڈیشن)